

سيرة

فاطمة الزهراء

رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهَا

طالب هاشمي

سیرة

خاتونِ جنتِ سیدتنا

فاطمة الزهراء
رضی اللہ تعالیٰ عنہا

بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مؤلفہ
طالبہ الہاشمی

المدیر پبلی کیشنز

23 بیاچٹ مارکیٹ، اردو بازار لاہور

فون: 0300-8485030 - 042-37225030

۲۹۷ ۳ ۹۹۲۱

ف ۲۸ ب

۴۵۴۱۱

۱۵

﴿جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں﴾

☆ نام کتاب سیرت حضرت فاطمہ الزہراء
☆ مصنف طالب ہاشمی
☆ ناشر عبدالحفیظ احمد
☆ اشاعت اکتوبر ۲۰۲۰ء
☆ مطبع علی اعجاز پرنٹرز لاہور
☆ قیمت 250/- روپے

ترتیب

۱۵

۷	جناب سردار علی احمد خان صاحب	دیباچہ	۱
۱۵	جناب طالب الہاشمی	عرض مؤلف	۲
۱۷	مادراں را اسوۂ کامل بتول رضی اللہ عنہا اقبال		۳
۲۲	نام والقباب		۴
۲۳	حسب و نسب		۵
۲۵	سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے والد گرامی صلی اللہ علیہ وسلم		۶
۲۶	سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا		۷
۳۷	رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ اطہار		۸
۴۱	سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی بہنیں		۹
۴۳	حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم		۱۰
۵۱	حضرت سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم		۱۱
۵۵	حضرت سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم		۱۲
۶۰	سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا (ولادت باسعادت)		۱۳
۶۱	بچپن سے سن شعور تک		۱۴
۶۷	شعب ابی طالب کی محسوری		۱۵
۷۲	عام الحزن (غم کا سال)		۱۶
۷۴	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سوادہ رضی اللہ عنہا سے نکاح		۱۷

۷۷	رحمتِ عالم ﷺ کا سفرِ طائف	۱۸
۸۳	ہجرت	۱۹
۸۶	شادی	۲۰
۹۹	نیا گھر	۲۱
۱۰۱	ازدواجی زندگی	۲۲
۱۰۷	شامل و خصائل	۲۳
۱۰۹	عبادت اور شب بیداری	۲۴
۱۱۱	علم و فضل	۲۵
۱۱۳	زہد و قناعت	۲۶
۱۲۲	ایشا و سخاوت	۲۷
۱۲۶	شرم و حیا	۲۸
۱۲۸	انسانی ہمدردی	۲۹
۱۳۰	رسولِ پاک ﷺ کی فرمانبرداری	۳۰
۱۳۳	باپ بیٹی کی محبت	۳۱
۱۳۸	اعزہ و اقربا کی محبت	۳۲
۱۴۱	سوتیلی ماؤں سے تعلق	۳۳
۱۴۳	نواسوں اور نواسیوں سے حضور ﷺ کی محبت	۳۴
۱۴۷	ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بارگاہِ سیدہ خنیسہ رضی اللہ عنہا میں حاضری	۳۵
۱۴۹	سیدالانام ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ محمد ﷺ کی مثال دئی	۳۶
۱۵۱	واقعہء مباہلہ	۳۷
۱۵۵	سرورِ کونین ﷺ کا وصال	۳۸
۱۶۰	میراثِ رسول ﷺ کا معاملہ	۳۹

۱۶۴	سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کا سفرِ آخرت	۴۰
۱۷۱	مناقب	۴۱
۱۷۹	زوجِ بتول رضی اللہ عنہا (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)	۴۲
۲۱۷	سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کی خوشدامن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ اسد	۴۳
۲۲۳	حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی اولاد	۴۴
۲۲۴	سیدنا حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما	۴۵
۲۳۶	سیدنا حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما (شہیدِ کربلا)	۴۶
۲۳۶	حضرت زینب کبریٰ رضی اللہ عنہا (خاتونِ کربلا)	۴۷
۲۶۲	حضرت اُمّ کلثوم بنتِ علی رضی اللہ عنہا	۴۸
۲۶۵	حضرت فضہ رضی اللہ عنہا (سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی وفادار کنیز)	۴۹
۲۶۸	خواتینِ اسلام سے خطاب (ماہر القادری مرحوم)	۵۰
۲۷۰	کتابیات	۵۱

تہدیہ

اُن

ماں، بہنوں، بیٹیوں اور بیبیوں کے نام

جنھوں نے

مغرب کی حیا سوز تحریک نسوانیت سے کوئی تعلق نہ رکھنے

اور

جگہ گوشہ رسول سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہرا بتولؑ

کے نقش قدم پر چلنے کا عزم کر لیا ہے



تابِ تو سرمایہ فانوسِ ما

قوتِ دین و اساسِ ملت است

فکرِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما

در نفسِ ہائے تو سوزِ دینِ حق

اے روایتِ پردہ ناموسِ ما

طینتِ پاکِ تو ما را رحمت است

مے ترا شد مہرِ تو اطوارِ ما

اے امینِ نعمتِ آئینِ حق

آنکہ ناز و بر و جودش کائنات

ذکرِ او فرمود با طیب و صلوة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

(از سردار علی احمد خان صاحب)

یا خالقِ ارض و سما، صلوة و سلام نازل فرمائیے ہمارے آقا و مولا جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور آپ کی آل پر، آپ کے صحابہ اور زمرة احباب پر۔ اے مولائے کریم خصوصی درود و سلام ہو سید الانبیاء والمرسلین پر جو رحمۃ للعالمین ہیں، سراج منیر ہیں، بشیر و نذیر ہیں، شافع روزِ محشر ہیں، ساقی کوثر، صاحبِ قاتِ قوسین، صاحبِ خلقِ عظیم اور صاحبِ خیر کثیر ہیں، جن کی ذاتِ گرامی تمام کمالات و صفات کی جامع ہے۔ سرکارِ کاسوۃ حسنہ انسانیت کا آخری معیار ہے۔ حضور کی اطاعت ہی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہوتی ہے۔ حضور کی ذاتِ پاک عبدیت و رسالت کا منتہائے کمال ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشیتم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

(غالب)

تاریخِ عالم اس حقیقت پر گواہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہترین قبیلے اور سب سے اعلیٰ کنبے سے معبوث کیے گئے۔ آنحضور کی شرافت و سیادت والی آلِ پاک اور آپ کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم خلقِ خدا کے امام و مقتدا ہیں۔ سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاقیامت اپنے اہلِ امت کے لیے دو چیزیں بطور ورثہ چھوڑیں۔ اُن دو گراں قدر چیزوں میں ایک کتاب اللہ ہے اور دوسری آپ کی عترت و اہل بیت۔ اس

ضمن میں امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے یہ بھی ایک موقع پہ اضافی ارشاد فرمایا کہ کتاب اللہ اور اہل بیت و عترت رسول مقبولؐ دونوں ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ آپؐ سے حوض کوثر پر ملاقات کریں۔ حضرت احمد مختار رضی اللہ عنہ کی چار طاہر و طیب بیٹیاں حضرت ام المؤمنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطنِ نوری سے پیدا ہوئیں۔ ان صاحبزادیوں کے اسم ہائے مقدس، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہ الزہراءؓ ہیں۔ حضرت زینبؓ باقی صاحبزادیوں سے بڑی تھیں۔ ان کی ولادت کے وقت حضور اقدسؐ کی عمر شریف تیس برس تھی۔ حضرت زینبؓ نے بعثت کا زمانہ پایا اور پھر ہجرت کی۔ آپ کا عقد آپ کے خالہ زاد ابوالعاصؓ لقیط ابن ربیع سے ہوا۔

حضرت بی بی زینبؓ ہجرت کے آٹھویں سال فوت ہوئیں۔ حضرت زینبؓ کا ایک بیٹا علی نامی تھا جو صغریٰ میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ بچہ فتح مکہ کے روز سواری پر آقائے نامدار فخر موجودات سرورِ کونین ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی ایک بیٹی امامہؓ تھیں جن سے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی وفات کے بعد نکاح کر لیا تھا۔

سرورِ کائنات ﷺ کی دوسری بیٹی حضرت رقیہؓ کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ اس وقت حضورؐ کی عمر تینتیس (۳۳) سال تھی۔ حضرت رقیہؓ سیدنا عثمان غنیؓ کے نکاح میں آئیں۔ آپ کو دو ہجرتوں کی سعادت ملی یعنی حبشہ اور مدینہ منورہ کی۔ آپ نہایت خوش شکل تھیں۔ حضورؐ بدر کی مہم پر تھے جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا ان کی وفات کے بعد حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت ام کلثومؓ سے ہوا۔ بنا بریں حضرت عثمانؓ کا لقب ذوالنورین ہوا۔ حضرت ام کلثومؓ چھ برس کی ازدواجی زندگی گزار کر ہجرت کے نویں سال رحمتِ حق میں پیوست ہو گئیں۔

اُن سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی نمازِ جنازہ خود سرورِ عالم ﷺ نے پڑھائی۔ ایک روایت کے مطابق خاتونِ جنت بی بی فاطمہ الزہراءؑ کی ولادت باسعادت سرکارِ دو جہانؑ کی بعثت کے پہلے سال ۲۰ جمادی الاخریٰ، بروز جمعہ، مکہ مکرمہ میں ہوئی، اُس وقت حضورؐ کی عمر کا اکتالیسواں سال تھا۔ بعض دوسری روایتوں میں حضرت فاطمہؑ کی پیدائش نبوت سے پانچ سال قبل بیان کی گئی ہے۔ والدِ گرامیؑ نے نومولود بیٹی کا نام فاطمہ اور کنیت ام محمد رکھی اور لقب راضیہ، مرضیہ، میمونہ، زکیہ، بتول، زہرا عنایت فرمائے۔

صاحبِ روضۃ الواعظین نے لکھا ہے کہ سیدہ فاطمہؑ کی پیدائش سے کافی عرصہ پہلے نبی کریمؐ نے حضرت خدیجہؑ سے فرمایا تھا کہ مجھے روح الامینؑ نے خبر دی ہے کہ بیٹی تولد ہوگی اور اس کا نام فاطمہ رکھا جائے کہ یہ اُن کا نسلی نام ہوگا۔ اس کے معنی پاک، بابرکت، پاکیزہ اور خجہ اطوار کے ہیں۔

ایک مرفوع روایت کے مطابق صاحبزادی کا نام فاطمہ اس لیے رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اور اُن کی اولاد کو قیامت کے روز آتشِ دوزخ سے آزاد کر دیا ہوا ہے۔ لقب بتول اس وجہ سے معروف ہوا کہ آپ اپنے عہد کی بیشتر خواتین سے حسبِ نسب، دین، فضل، تقویٰ اور طہارت میں ممتاز ہیں۔ اس بارے میں دوسری روایت یہ ہے کہ آپؑ نے دنیا سے قطع تعلق کر کے خالقِ اکبر سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔

حضرت سیدہ فاطمہؑ الزہراءؑ کے مناقبِ عالی، انسانی فہم و ادراک سے بالا ہیں۔ ہم تو صرف یہی جانتے ہیں کہ سیدہؑ کے والدِ گرامی سید الانبیاء والمرسلین جنابِ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ آپ کے شوہر نامدار امیر المؤمنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ آپ کی مادرِ مشفقہ ام المؤمنین سیدہ خدیجہؑ، آپ کے فرزند ان والا گھر حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ جو انانِ جنت کے سردار ہیں۔

مفکر اسلام علامہ محمد اقبالؒ نے رموزِ بخودی میں کیا خوب لکھا ہے:

مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ

مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت

با یہودی چادرِ خودرا فروخت

نوری و ہم آتشی فرماں برش

گم رضائش در رضائے شوہرش

آں ادب پروردۂ صبر و رضا

آسیا گردان و لب قرآں سرا

گریہ ہائے او زبائیں بے نیاز

گوہر افشاندے بدامانِ نماز

محسنِ انسانیت رحمتِ عالم ﷺ نے جس فقید المثال معاشرۂ انسانی کی داغ بیل ڈال کر اس کی تربیت و تکمیل فرمائی، اس کے نتیجہ میں ابنائے آدم کو حسنِ عمل اور نورِ ہدایت کا ابدی سرچشمہ میسر آیا۔ عالمِ انسانیت کے لیے یہ فخرِ موجودات ﷺ کا عظیم ورثہ و تحفہ ہے اور اس کے عملی نمونے اصحابِ رسولؐ، اُمہات المؤمنینؑ اور عترت و آلِ محمدؐ ہیں۔ اس پاکیزہ معاشرے کا ایک درخشاں و نمایندہ باب حضرت فاطمہؑ کی سیرتِ طیّہ ہے۔ بنتِ رسولِ مقبولؐ سیدہ بتولؑ نے اپنے مثالی حسنِ عمل اور ذی وقار کردار سے یہ ثابت کر دکھایا کہ اولاد کے اخلاق و کردار، فکرِ بلند، علو ہمتی، عزائم و رجحانات اور صلاحیتوں کی تخلیق میں ماں کا کتنا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مسلمان عورت کے لیے حضرت فاطمہؑ کی سیرتِ طیّہ اُسوۂ محمدیؐ کی روشن مثال ہے اور یہ ہر زمانہ اور ہر دور میں مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ وہ نورانی نقشِ کامل ہے جو تا ابد تابندہ و پائیندہ رہیگا۔

حضرت فاطمۃ الزہراءؑ اپنے والد کی فرماں بردار بیٹی تھیں اور حضور شافع یوم النشور کی مزاج شناس بھی تھیں۔ انہوں نے اپنے والدِ معظم سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ آپ حضورِ اعلیٰ کے خلقِ عظیم کا نمونہ تھیں۔ اخلاق و عادات اور گفتگو میں رسول اللہ سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتی تھیں۔ سخاوت کا یہ عالم کہ کبھی کسی سائل کو اپنے در سے خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ بطور عادت آپ ہمیشہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتیں اور ہر چھوٹے بڑے سے نرمی اور مہربانی سے پیش آتیں۔

سیدہ فاطمہؑ حضرت رسالت مآب کو بے حد عزیز تھیں۔ وہ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوتیں تو حضور کھڑے ہو جاتے اور صاحبزادی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے پاس بٹھا لیتے۔ رحمتِ دو عالم ﷺ کا حضرت فاطمہؑ کے لیے کمال درجہ پیار اور محبت بھری تکریم سیدہ کی فضیلت پر دال ہے اور ان کے بلند رتبہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس عالی گوہر خاتون نے آغوشِ رسالت میں اصولِ زندگی سیکھے اور ان پر کما حقہ عمل کیا۔ چنانچہ معرفتِ الہی، اطاعتِ رسول، تقویٰ و پاکیزگی، عفتِ مآبی، توکل اور راضی برضائے الہی کے باعث آپ آسمانِ اسلام کا درخشاں ستارہ بن گئیں۔

حضرت سیدہ کا نکاح کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ حضور پر نور نے ایک مرتبہ حاضرینِ مجلس کو اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی بیٹی فاطمہؑ کا نکاح علی بن ابی طالب سے کر دوں۔ پس تم سب گواہ ہو کہ میں نے چار سو مثقال چاندی کے حق مہر کے عوض ان کا عقد کر دیا بشرطیکہ علیؑ (جو اس وقت حاضر نہ تھے) رضامند ہوں۔ اتنے میں حضرت علیؑ تشریف لائے، انہوں نے ارشادِ نبویؐ سن کر عرض کیا کہ میں راضی ہوں۔ نکاح کے بعد رسول ﷺ نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ زوجین کی پریشانیوں کو رفع کرے اور ان کی نسل کو معزز

کرے اور میاں بیوی دونوں پر خداوند کریم کی برکت نازل ہو اور ان کی پاکیزہ نسل کو اللہ تعالیٰ دنیا میں پھیلائے۔

امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے سیدہ فاطمہؑ کی زندگی میں کسی اور خاتون سے نکاح نہیں کیا۔ روایت ہے کہ جب جناب علیؑ نے جویریہ یا غوراء بنت ابوجہل کو نکاح کا پیغام دیا تو رسول اکرم ﷺ منبر پر رونق افروز ہوئے اور بھری مجلس میں یوں ارشاد فرمایا:

”بنو ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اجازت طلب کی تھی کہ وہ اپنی دختر کا نکاح علیؑ بن ابی طالب سے کر دیں۔ میں انہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ دوبارہ کہتا ہوں کہ میں انہیں اجازت نہیں دوں گا۔ ہاں ایک صورت یہ ہے کہ علیؑ ابن ابی طالب میری بیٹی کو طلاق دے دے تب ان کی بیٹی سے نکاح کر لے۔ فاطمہؑ میری لخت جگر ہے۔ جو چیز اُسے مضطرب کرتی ہے اور جو چیز فاطمہؑ کو تکلیف دیتی ہے وہ مجھے تکلیف دیتی ہے۔ خدا کی قسم رسول خدا اور دشمن خدا کی بیٹیاں ایک مرد کے پاس جمع نہیں ہو سکتیں۔“

چنانچہ حضرت علیؑ نے دوسرے نکاح کا ارادہ ترک کر دیا۔ دنیاوی مال و دولت کے اعتبار سے حضرت علیؑ تنگ دست رہتے تھے۔ پیغمبر خداؐ جب اپنی چہیتی بیٹی کے ہاں مفلسی دیکھتے تو اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے لیکن صابر و شاکر بیٹی کی قناعت پر اطمینان کا اظہار فرماتے۔ دو جہان کے بادشاہ کی نور عین صبر و شکر کا پیکر بنی رہیں۔ کیا مجال کہ مفلسی کی شاکی ہوں۔ گھر میں کئی بار فقر و فاقہ کی نوبت آ جاتی، آپؐ خندہ پیشانی سے اس پر صبر کیا کرتیں۔ ایک روز حضرت علیؑ گھر تشریف لائے اور فوراً کچھ کھانے کو مانگا۔ سیدہؑ نے بتایا کہ مسلسل تین روز سے گھر میں اناج کا ایک دانہ تک نہیں۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ آپ نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ جو اب سیدہ

نے فرمایا کہ اے شوہر محترم میرے والد گرامی نے رخصتی کے وقت مجھے یہ نصیحت کی تھی کہ میں کبھی کوئی سوال کر کے آپ کو شرمندہ نہ کروں۔

خاتونِ جنت سیدہ فاطمہؓ گھر کا تمام کام کاج خود کرتی تھیں۔ چکی سے آٹا پیس پیس کر ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ گھر بار کی صفائی اور چولہا پھونکنے سے کپڑے میلے ہو جاتے لیکن آپ اس مشقت سے گھبراتی نہ تھیں۔ گھر کے دھندوں کے علاوہ یہ پاک بی بی عبادتِ الہی بھی کثرت سے کیا کرتی تھیں۔ حضرت امام حسنؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنی والدہ محترمہ کو شام سے صبح تک عبادت کرتے اور خدا کے حضور گریہ وزاری کرتے دیکھا۔ لیکن انہوں نے اپنی دعاؤں میں اپنے لیے کبھی کوئی درخواست نہ کی۔

ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے سیدہ فاطمہؓ سے پوچھا کہ مسلمان عورت کے اوصاف کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ ”عورت کو چاہیے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے۔ اپنی اولاد پر شفقت کرے اور اپنی نگاہ نیچی رکھے۔ اپنی زینت چھپائے۔ نہ خود غیر کو دیکھے نہ غیر اس کو دیکھنے پائے“۔ سرورِ کائنات ﷺ صاحبزادی کا یہ جواب سن کر بہت مسرور ہوئے۔

محدثین اور مؤرخین نے سیدہ فاطمہؓ کے کتنے ہی فضائل لکھے ہیں۔ آنحضرتؐ نے کتنی بار مختلف موقعوں پر ارشاد فرمایا کہ فاطمہؓ جتنی عورتوں کی سردار ہیں۔

خداوند قدوس سے دعا ہے کہ وہ ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو حضرت سیدہ فاطمہؓ الزہراء رضی اللہ عنہا کی سیرت پاک پر عمل کرنے اور ان کے اُسوۂ حسنہ پر اپنے اخلاق و کردار کو استوار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

فاضل محترم جناب طالب ہاشمی مدظلہ العالی دورِ حاضر کے ایک بلند پایہ ادیب اور معروف مؤرخ و سوانح نگار ہیں۔ صاحب موصوف ایک حقیقت پسند محقق

بھی ہیں اور اہل علم و دانش میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ ہاشمی صاحب ایک خاموش لیکن موثر مبلغ اسلام ہیں۔ بزبانِ قلم آپ اپنے مخصوص انداز میں تبلیغ اسلام کا فریضہ بطریق احسن اور دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ادا کر رہے ہیں۔ اس کا خیر کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور دینی، دنیوی اور اخروی سعادتوں سے مالا مال کرے (آمین) طالب ہاشمی صاحب کی نگارشات نور و حکمت کے روشن چراغوں کے مثل ہیں کہ جن کی روشنی اور حرارت اہل ایمان کے قلب و ذہن کو منور اور قوائے عمل کو نمودِ تازہ دے کر حرکت پذیر کرنے کا سامان پیدا کرتی ہے۔ آپ کی تازہ ترین تالیف ”سیرۃ سیدہ فاطمہ الزہراء“ اسلامی لٹریچر میں گر انقدر اضافہ ہے۔ فاضل مؤلف نے نہایت تحقیق سے کتاب کو مدون کر کے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا پڑھنا اور سننا بمنزلہ عبادت ہے اور مؤلف کے لیے توشہٴ آخرت۔

راجی شفاعت و غفران

سردار علی احمد خان

۸-۱ فتح گارڈن ٹاؤن لاہور

۲۴-۱ اپریل ۱۹۸۵ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

عرضِ مؤلف

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھ ہچمدان ہچمیر زکو جگر گوشہ رسول نور چشم مصطفیٰ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سیرۃ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں نے اس کتاب کو صرف سیدۃ النساء کے سوانح حیات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں ان کے بیشتر متعلقین — اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ (والدہ) حضرت زینب بنت رسول اللہ (بہن) حضرت رقیہ بنت رسول اللہ (بہن) حضرت اُمّ کلثوم بنت رسول اللہ (بہن) حضرت فاطمہ بنت اسد (خوشدامن) حضرت علی کرم اللہ وجہہ (زوج) سیدنا حضرت حسن بن علی (فرزند) سیدنا حضرت حسین بن علی (فرزند) حضرت زینب بنت علی (دختر) حضرت اُمّ کلثوم بنت علی (دختر) اور حضرت فضہ (خادمہ) کے سوانح حیات بھی بیان کر دیئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب سیدہ فاطمہ الزہراء کی جامع سیرت بن گئی ہے۔ چونکہ کتاب کا غالب حصہ سیدہ فاطمہ الزہراء کے وقائع حیات پر مشتمل ہے اس لیے اس کا نام ”سیرۃ حضرت فاطمۃ الزہراء“ ہی رکھا گیا ہے۔ سیدہ کے والد گرامی سرور کائنات فخر موجودات رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ کا مکمل احاطہ کرنا اس کتاب کے محدود صفحات میں ممکن نہ تھا اس لیے میں نے حضور پر نور کی سیرۃ طیبہ کی صرف چند ایسی جھلکیاں پیش کرنے پر اکتفاء کیا ہے جن کا کچھ نہ کچھ

تعلق سیدہ فاطمہ الزہراء سے تھا۔

ایک مسلمان خاتون کے لیے سیرۃ فاطمہ الزہراء میں اس کی زندگی کے تمام مراحل، بچپن، جوانی، شادی، رخصتی، سسرال، شوہر، خانہ داری، عبادت زہد و قناعت، پرورشِ اولاد، صدقہ و خیرات، اعزہ و اقربا سے محبت غرض ہر مرحلہ حیات کے لیے قابلِ تقلید نمونہ موجود ہے۔

سیدۃ النساء کے پاکیزہ نقوشِ حیات دخترانِ اسلام کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور ان کی پیروی دنیا و آخرت میں فلاح اور کامرانی کی ضامن ہے۔

اگرچہ یہ کتاب میرے خیال میں موضوع کے اعتبار سے مکمل ہے لیکن اگر اربابِ علم و دانش کو اس میں کچھ فروگزاشتیں نظر آئیں تو وہ براہِ کرم انہیں میری کوتاہی علم و نظر پر محمول کرتے ہوئے اپنے مفید مشوروں سے مستفیض فرمائیں۔ انہیں دلی شکرِ بے کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

میں جناب سردار علی احمد خان صاحب مدظلہ کا عمقِ قلب سے سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ مجھ خاکسار کے بارے میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے یہ ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس حسنِ ظن کے لیے اجرِ جزیل عطا فرمائے۔
(آمین)

راجی غفران و شفاعت

خاکسار طالبِ الہاشمی

ملتان روڈ — لاہور

۱۸ شوال المکرم ۱۴۰۵ھ

۷ جولائی ۱۹۸۵ء

مادراں را اسوۂ کاملِ بتولؑ

حکیم الامتہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

مزرعِ تسلیم را حاصلِ بتولؑ
مادراں را اسوۂ کاملِ بتول

بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت
بایہودی چادرِ خود را فروخت

نوری وہم آتشی فرماں برش
گم رضائش و ررضائے شوہرش

آں ادب پروردہ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

گریہ ہائے او زبالیں بے نیاز
گوہر افشانندے بدامانِ نماز

اشکِ او پر چید جبریلِ امیں
ہم چو شبنم ریخت بر عرشِ بریں

رشتہ آئینِ حق زنجیرِ پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰ ست

ورنہ گردِ ترتبشِ گردیدے
سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدے

ترجمہ

☆ — حضرت سیدہ بتولؑ کی شان یہ ہے کہ وہ تسلیم ورضا کی کھیتی کا حاصل اور ماؤں کے لیے تقلید کا مکمل اور بہترین نمونہ ہیں —



☆ — ایک محتاج کی خاطر ان کا دل ایسا تڑپا کہ اس کی اعانت کے لیے ایک یہودی کے پاس اپنی چادر فروخت کر دی —



☆ — نوری بھی اور ناری بھی سب ان کے فرماں بردار تھے۔ انہوں نے شوہر کی رضا میں اپنی رضا گم کر دی۔



☆ — انہوں نے صبر ورضا کے لیے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی کہ چکی چلاتی رہتی تھیں اور لب ہائے مبارک پر قرآن کی تلاوت جاری ہوتی تھی۔



☆ — ان کا گریہ تکیہ سے بے نیاز تھا وہ اپنے آنسوؤں کے موتی جانماز پر گرایا کرتی تھیں (کیونکہ ان کی راتیں بستر پر نہیں بلکہ مصلے پر گزرتی تھیں۔)

☆ — ان کے آنسو جبریل امین زمین سے چلتے تھے اور قطراتِ شبنم کی طرح انہیں عرشِ بریں پر ٹپکا دیتے تھے۔



☆ — میرے پاؤں میں شریعت کے رشتے کی زنجیر پڑی ہوئی ہے اور جنابِ مصطفیٰ ﷺ کے فرمان کا پاس ہے۔



☆ — ورنہ میں ان کی تربت کا طواف کرتا — اور اپنے سجدے اس کی خاک پر نچھاور کرتا۔



۱۵



خاتونِ جنت

حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا

بنت

رسول اللہ ﷺ



نام والقباب

اسم گرامی فاطمہ ہے۔

علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ فطم کے معنی لغت میں بچے کو دودھ پینے سے روکنے کے ہیں تو گویا فاطمہ لوگوں کو دوزخ کی آگ سے روکنے والی ہیں۔

چند مشہور القاب یہ ہیں:

- (۱) زہراء — یعنی تازہ پھول کی طرح پاکیزہ — حسین و جمیل۔
- (۲) بتول — اللہ کی سچی اور بے لوث بندی — اللہ کی راہ میں دنیا سے قطع تعلق کر لینے والی۔
- (۳) سیدۃ النساء العالمین — سارے جہانوں کی عورتوں کی سردار۔
- (۴) سیدۃ النساء اہل الجنۃ — جنت کی عورتوں کی سردار۔
- (۵) زاکیہ — نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ عادات و اخلاق والی۔
- (۶) راضیہ — اللہ اور رسول کی رضا پر راضی رہنے والی۔
- (۷) بضعتہ الرسول — جگر گوشہ رسول۔
- (۸) البضعتہ النبویہ — نبی ﷺ کی لخت جگر۔
- (۹) ام ابیہا — کریمۃ الطرفین — باپ اور ماں دونوں کی نسبت سے عالی

مرتبہ۔

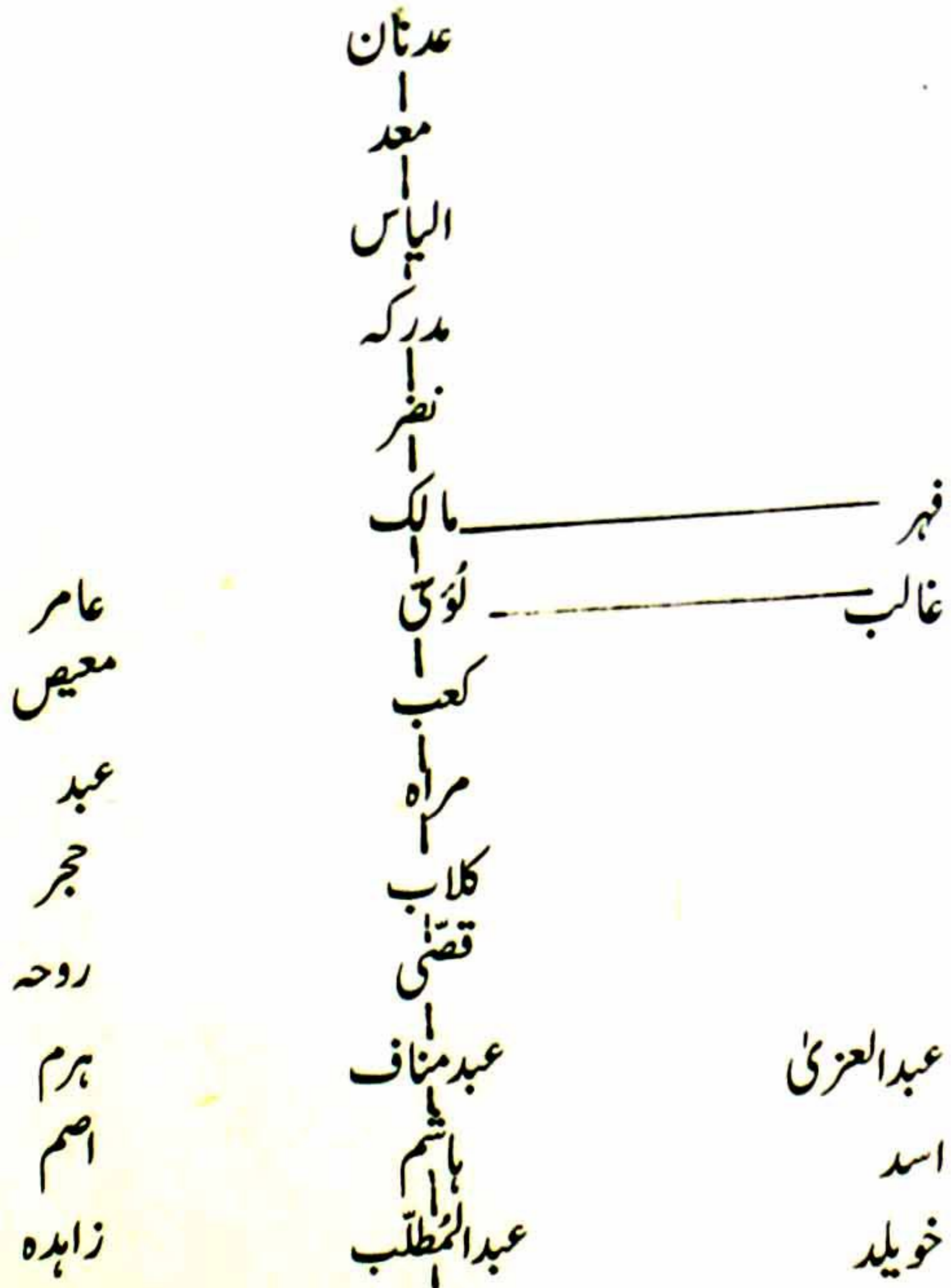
۶۵۶۱۱

- (۱۰) طاہرہ — پاک باز خاتون
 (۱۱) مُطہرہ — پاک صاف خاتون
 (۱۲) مرضیہ — اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی مرضی پر چلنے والی۔
 (۱۳) عذرا — دوشیزہ۔



حسب و نسب

سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سرور کونین فخر موجودات رحمت
 دو عالم سید الانبیاء والرسل خیر الخلاق شافع محشر ساقی کوثر جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ
 صلی اللہ علیہ وسلم اور محسنہ اسلام مجسمہ شرافت فخر عرب اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ
 طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ دھدیال اور نھیال دونوں
 کا تعلق عرب کے معزز ترین قبیلہ قریش سے تھا۔ پدیرگرمی اور والدہ ماجدہ دونوں کا
 سلسلہ نسب قصی پر ایک دوسرے سے مل جاتا ہے۔ شجرۂ نسب یوں ہے:



فاطمہ (زوجہ خوید بن اسد)

خدیجۃ الکبریٰ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خدیجۃ الکبریٰ

سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء

سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا

کے والدِ گرامی ﷺ

جیسا کہ سیدۃ فاطمۃ الزہراء کے حسب و نسب میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اُس ذاتِ گرامی کی صاحبزادی تھیں جو سید الانبیاء والمرسلین تھے، صاحبِ قَابِ قَوْسَیْن تھے، محبوبِ رب العالمین تھے، خیر الخلائق اور سیدۃ الانام تھے، رحمۃً لِلْعَالَمِیْنَ اور سراجِ منیر تھے، خاتم النبیین اور شفیع المذنبین تھے۔ آپ کی شان بیان کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، مختصر یہ کہ:

لَا يُبْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّهُ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

خلاصہ کائنات فخرِ موجودات ﷺ کی حیاتِ طیّہ کا ذکر خیر تفصیل چاہتا ہے۔ اس کتاب کے محدود صفحات میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے البتہ آپ کی حیاتِ طیّہ کے چند ابواب جن سے سیدہ فاطمۃ الزہراء کا کچھ تعلق ہے اس کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ توفیقِ الہی شاملِ حال ہوئی تو حضور پر نور ﷺ (فداہ ابی و امی) کی سیرتِ طیّہ پر الگ کتاب پیش کی جائے گی۔

السَّعْيُ مِنَّا وَالْإِتِّمَامُ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى

سیدۃ النساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی والدہ ماجدہ اُمُّ الْمُؤْمِنِینِ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

اُمُّ الْمُؤْمِنِینِ حضرت خدیجۃ الکبریٰ بختِ محمدیؐ کے بعد اسلام کی خاتونِ اول ہیں اور اپنے گونا گوں فضائل و مناقب کی بناء پر انہیں تاریخِ اسلام میں نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔

نام خدیجہ اور لقب طاہرہ تھا، باپ کا نام خویلد اور ماں کا نام فاطمہ تھا۔ باپ اور ماں دونوں قریشی النسل تھے اور یوں وہ نہ صرف نجیب الطرفین تھیں بلکہ سرورِ کونین ﷺ کی ایک جدی بھی تھیں۔

باپ کا شجرۂ نسب یہ ہے:

خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی

(قصی جناب رسولِ اکرم ﷺ کے بھی جدِ اعلیٰ تھے)

ماں کا شجرۂ نسب یہ ہے:

فاطمہ بنتِ زائدہ بن اصم بن ہرم بن رواحہ حجر بن عبد بن معیص بن عامر بن

لؤسی۔

(لؤسی حضور ﷺ کے بھی مورثِ اعلیٰ تھے)

حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد بن اسد بہت بڑے تاجر تھے اور اپنی خوش

معاملگی اور دیانت کی بدولت وہ تمام قریش اور عرب کے دوسرے قبائل میں بھی

بڑی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ عام الفیل سے پندرہ سال قبل پیدا ہوئیں۔ بچپن سے ہی نہایت سلیم الفطرت تھیں۔ جب سن شعور کو پہنچیں تو ان کی شادی ابوہالہ تمیمی سے ہوئی۔ ابوہالہ سے حضرت خدیجہؓ کے دو لڑکے ہوئے، ایک کا نام ہالہ تھا اور دوسرے کا ہند۔ ہالہ کے بارے میں اہل سیر میں اختلاف ہے کہ وہ زمانہ جاہلیت میں مر گیا یا وہ شرف صحابیت سے بہرہ ور ہوئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ”إصابة“ میں ابوہالہ کے ایک فرزند کا نام حارث لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ وہ ابتدائے بعثت میں ایمان لائے، ایک دفعہ حضورؐ نے حرم کعبہ میں لوگوں کو توحید کی دعوت دی تو کفار نے آپؐ پر حملہ کر دیا۔ حارث بن ابوہالہ نے سنا تو دوڑے آئے اور حضورؐ کو بچانا چاہا۔ کفار آپؐ کو چھوڑ کر حارث پر ٹوٹ پڑے اور تلواریں مار مار کر انہیں اسی جگہ شہید کر دیا۔ اس طرح انہیں سب سے پہلے حضورؐ پر جان قربان کی سعادت نصیب ہوئی۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے ”رحمۃ اللعالمین“ میں لکھا ہے کہ ابوہالہ کی صلب سے حضرت خدیجہؓ کے تین لڑکے ہالہ، طاہر اور ہند ہوئے۔ ان تینوں بھائیوں کو شرف صحابیت حاصل ہوا۔ ہالہ کے بارے میں انہوں نے صحیح بخاری کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے حضورؐ سے اندر حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔ حضورؐ نے ان کا نام سن کر فرمایا: اَللّٰهُمَّ هَالِه — لیکن صحیح بخاری کی اصل روایت کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ واقعہ دراصل حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہ بنت خویلد سے متعلق ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ (حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد) حضورؐ سے اندر آنے کا اذن مانگا۔ ان کی

ابوہالہ کے نام کے بارے میں ارباب سیر میں سخت اختلاف ہے، کسی نے نباش بن زرارہ لکھا ہے، کسی نے ہند بن نباش اور کسی نے ابوہالہ بن نباش لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس کا اصل نام کچھ بھی ہو، کنیت ابوہالہ پر سب کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ ابوہالہ کا باپ اپنی قوم میں بڑا شریف متصور کیا جاتا تھا وہ اپنے بیٹے کے ساتھ مکہ آیا تھا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی حضورؐ کو اس موقع پر حضرت خدیجہؓ یاد آ گئیں۔ آپ نے قدرے تامل کے بعد فرمایا ”ہالہ ہوں گی“۔

طاہرؓ کے بارے میں قاضی صاحب نے ”حسن الصحابہ“، ”معجم البلدان“ اور ”استیعاب“ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضورؐ نے انہیں ایک ربع یمن کا حاکم مقرر فرمایا تھا اور حضورؐ کے وصال کے وقت وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔ ان کی حکومت میں قبائل عک اور اشعرمین تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے آغاز میں فتنہ ارتداد پھیلا تو یہ قبیلے سب سے پہلے مرتد ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طاہرؓ کو ان کی سرکوبی پر مامور کیا۔ طاہرؓ نے مسروق بن الابدع کے ساتھ مل کر مرتد قبائل کو شکست فاش دی۔

ہالہؓ اور طاہرؓ نے کب وفات پائی۔ کتب سیر میں اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ بہر حال ہالہؓ اور طاہرؓ کے بارے میں اہل سیر میں اختلاف اپنی جگہ موجود ہے۔ البتہ ہند بن ابو ہالہ کے صحابی ہونے پر سب ارباب سیر کا اتفاق ہے۔ ان کی پرورش خود رسول اکرم ﷺ نے فرمائی۔ انہیں فصاحت و بلاغت میں کمال حاصل تھا۔ وہ حضور ﷺ کا حلیہ مبارک نہایت خوبی اور صحت سے بیان کیا کرتے تھے اس لیے ”وصاف النبیؐ“ کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ حضرت ہند رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طویل عمر پائی اور جنگ جمل (۳۶ ہجری) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔

حافظ ابن عبدالبر اندلسی نے ”الاستیعاب“ میں لکھا ہے کہ حضرت ہندؓ کے ایک فرزند کا نام بھی ہند تھا۔ انہوں نے بصرہ میں بعارضہ، طاعون انتقال کیا تو ان کا جنازہ اٹھانے والے صرف چار آدمی تھے کیونکہ لوگ اپنے اپنے مردوں کی تجھیز و تکفین میں مصروف تھے۔ ایک عورت نے یہ دیکھا تو رو رو کر دہائی دینے لگی:

”وَ اِهْنَدَ بِنِ هِنْدٍ ابْنِ رَبِيبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ“

اس کی پکار سن کر سب لوگ اپنے عزیزوں کے جنازوں کو چھوڑ کر ان کے جنازہ پر جمع ہو گئے اور سارے بازار میں بند ہو گئے۔ (رحمۃ اللعالمین جلد دوم)

ابو ہالہ کا انتقال جوانی کے عالم میں ہی ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائد (یا عابد) مخزومی سے ہوا۔ اس سے بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ہند تھا۔ ہند بنت عتیق کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے بھی حضورؐ کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی اور شرفِ صحابیت حاصل کیا۔ واللہ اعلم بالصواب

سرورِ کائنات ﷺ کے نکاح میں آنے سے پہلے حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے والد خویلد بن اسد ”حربِ نجار“ میں مارے جا چکے تھے (عام الفیل کے بیس سال بعد) اور ان کے چچا عمرو بن اسد ان کے سر پرست تھے۔

خویلد بن اسد کے ترکے میں سے حضرت خدیجہؓ کو نہایت وسیع کاروبارِ تجارت ملا۔ انہوں نے اس کاروبار کو چلانے کے لیے بہت سے عرب یہودی اور عیسائی غلاموں اور ملازموں پر ایک عملہ رکھا ہوا تھا لیکن ان کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا شخص مل جائے جو بے حد قابل، ذہین اور دیانت دار ہو اور وہ اس نگرانی میں اپنے تجارتی قافلے شام اور یمن وغیرہ کو بھیجا کریں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سرورِ کونین ﷺ کے پاکیزہ اخلاق اور ستودہ صفات کا

اے قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کی رائے میں حضرت خدیجہؓ کا پہلا نکاح عتیق بن عائد مخزومی سے ہوا اور دوسرا ابو ہالہ سے۔ وہ لکھتے ہیں:

”مؤرخین میں اختلاف ہے کہ عتیق سے پہلا نکاح ہو یا ابو ہالہ سے۔ قنادہ نے عتیق کو پہلا بتایا ہے اور جرجانی نے ابو ہالہ کو۔ صاحب الاستیعاب نے بھی قولِ جرجانی کو صحیح کہا ہے۔ میں نے قولِ قنادہ کو اس لیے پسند کیا ہے کہ صاحب الاستیعاب نے ہند کو ربیب رسول اللہؐ لکھا ہے اور یہ تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ ابو ہالہ کے بعد نبی ﷺ کا نکاح (حضرت خدیجہؓ سے) ہوا ہو۔“ (رحمۃ اللعالمین جلد دوم)

چہ چامکہ کے گھر گھر میں پھیل چکا تھا اور آپ کو سب اہل مکہ امین کے لقب سے پکارنے لگے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کو حضورؐ کے اوصاف حمیدہ کا علم ہوا تو انہوں نے حضورؐ کو پیغام بھیجا کہ آپ میرا سامان تجارت شام لے جایا کریں تو دوسرے لوگوں سے دو چند معاوضہ آپ کو دیا کروں گی۔ سرورِ عالم ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کا پیغام منظور فرمایا اور ان کا سامان تجارت لے کر عازم بصری ہوئے۔ چلتے وقت حضرت خدیجہؓ نے اپنا غلام میسرہ بھی حضورؐ کے ساتھ کر دیا اور اسے تاکید کی کہ اثنائے سفر میں حضورؐ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

سرورِ عالم ﷺ کی بے مثل دیانت داری اور سلیقہ شعاری کی بدولت تمام سامان تجارت دو گنے منافع پر فروخت ہو گیا۔ دورانِ سفر میں سردارِ قافلہ یعنی سرورِ عالم ﷺ نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ ہر ایک آپ کا مداح بلکہ جاں نثار بن گیا۔ جب قافلہ مکہ واپس آیا اور حضرت خدیجہؓ کو میسرہ کی زبانی سفر کے حالات اور منافع کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو ان کے دل میں بے اختیار حضورؐ کی طرف بے پناہ کشش پیدا ہوئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان سے ایک چاندان کی گود میں آ کر گرا جس سے سارا عالم متور ہو گیا، جب انہوں نے اپنے خواب کی تعبیر ایک عیسائی عالم سے پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ:

”اے شریفہ عرب تمہیں بشارت ہو کہ دعائے خلیلؑ و نویدِ مسیحاؑ کا ظہور ہو چکا ہے اور تم ان کے عقد میں آؤ گی۔“

حضرت خدیجہؓ کے دل کی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا اور انہوں نے اپنی لونڈی نفیسہ کی معرفت حضورؐ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضورؐ کا ایماہ پا کر وہ حضرت خدیجہؓ کے چچا عمرو بن اسد کو بلا لائیں۔ اس وقت وہی ان کے سر پرست تھے۔ دوسری طرف سے سرورِ عالم ﷺ اپنے چچا ابوطالب اور دوسرے اکابرِ خاندان کے

ساتھ حضرت خدیجہؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت ابوطالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور ۵۰۰ درہم طلائی مہر قرار پایا۔ اس وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔

نکاح کے بعد حضورؐ اکثر گھر سے باہر رہنے لگے۔ کئی کئی روز مکہ کے پہاڑوں میں جا کر عبادتِ الہی میں مشغول رہتے۔ غرض اسی طرح حضورؐ غارِ حرا میں معتکف تھے کہ رَبِّ ذَوَالْجَلَالِ کے حکم سے جبریل امینؑ آپؐ کے پاس تشریف لائے اور کہا ”پڑھو“ حضورؐ نے فرمایا ”میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں“۔ اس پر حضرت جبریلؑ نے حضورؐ کو گلے لگا کر زور سے دبایا پھر چھوڑ دیا اور کہا ”پڑھو“ حضورؐ نے پھر فرمایا ”میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں“۔ جبریلؑ نے دوبارہ آپؐ کو پکڑ کر زور سے بھینچا، پھر چھوڑ دیا اور کہا ”پڑھو“ حضورؐ نے اب بھی وہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ جب جبریلؑ نے کہا:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ
وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ
يَعْلَمُ ۝

ترجمہ: ”پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا جس نے انسان کو پانی کے کیڑے (لہو کی پھٹکی) سے بنایا۔ پڑھ تیرا پروردگار بہت کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے آدمی کو علم سکھایا جو نہ جانتا تھا“۔

تو حضورؐ ﷺ کی زبان مبارک پر یہی کلمات جاری ہو گئے۔

اس حیرت انگیز واقعہ سے حضورؐ کی طبیعت بے حد متاثر ہوئی۔ گھر تشریف لائے تو فرمایا ”زَمَلُونِي زَمَلُونِي“ مجھ کو کپڑا اڑھاؤ، مجھ کو کپڑا اڑھاؤ۔ حضرت خدیجہؓ نے تعمیلِ ارشاد کی اور پوچھا کہ آپؐ کہاں تھے میں سخت فکر مند تھی اور کئی

آدمیوں کو آپ کی تلاش میں بھیج چکی تھی۔ حضور نے تمام واقعہ بی بی خدیجہ کے سامنے من و عن بیان کر دیا۔ حضرت خدیجہ نے فرمایا کہ ”آپ سچ بولتے ہیں۔ غریبوں کے دستگیر ہیں۔ مہمان نواز ہیں۔ صلہ رحم کا خیال رکھتے ہیں، امانت گزار ہیں اور دکھیوں کے خبر گیر ہیں۔ اللہ آپ کو تنہا نہ چھوڑے گا“ — پھر آپ کو ساتھ لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں جو زمانہ جاہلیت میں بت پرستی ترک کر کے عیسائی ہو گئے تھے اور گزشتہ الہامی کتابوں، توریت، زبور و انجیل کے بہت بڑے عالم تھے۔ بی بی خدیجہ نے تمام واقعہ جو حضور کو پیش آیا تھا ان کے سامنے بیان کیا۔ ورقہ یہ سنتے ہی بول اٹھے:

”یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ پر اترا تھا۔ اے کاش کہ میں اس زمانے

تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی۔“

حضور نے پوچھا، کیا یہ لوگ مجھ کو نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا ”ہاں جو کچھ

آپ پر نازل ہوا ہے جب کسی پر نازل ہوتا ہے تو دنیا اس کی مخالف ہو جاتی ہے،

اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔“ اس گفتگو کے بعد

ورقہ کا بہت جلد انتقال ہو گیا تاہم حضرت خدیجہ کو یقین کامل ہو گیا کہ حضور

منصب رسالت پر فائز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بلا تامل حضور پر ایمان لے آئیں۔

تمام کتب سیر متفق ہیں کہ عورتوں میں سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہونے والی

خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ ہیں۔

حضور سے نکاح کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ تقریباً ۲۵ سال تک

زندہ رہیں۔ اس مدت میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہر قسم کے روح

فرسا مصائب کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور آقائے دو جہاں ﷺ کی

رفاقت اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے اسلام

لانے کے بعد سرور کائنات ﷺ کے متعلقین میں بھی اسلام کی تڑپ پیدا ہوئی۔

نوجوانوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ، بڑوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ سب سے پہلے ایمان لائے۔ ان کے بعد دوسرے سعید الفطرت اصحاب بھی آہستہ آہستہ حلقہٴ اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ حضرت خدیجہؓ کو اسلام کی وسعت پذیری سے بے حد مسرت حاصل ہوتی تھی اور وہ اپنے غیر مسلم اعزہ و اقارب کے طعن و تشنیع کی پروا کیے بغیر اپنے آپ کو تبلیغِ حق میں رسول اللہؐ کا دست و بازو ثابت کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا تمام زر و مال اسلام پر نثار کر دیا اور اپنی ساری دولت یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری، بیکسوں کی دستگیری اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کے لیے وقف کر دی۔ ادھر کفارِ قریش نو مسلموں پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے تھے اور تبلیغِ حق کی راہ میں ہر طرح کے روڑے اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے رحمتِ عالم ﷺ اور آپؐ کے جاں نثاروں کو ستانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

جب حضور ﷺ کفار کی لالچنی اور بیہودہ باتوں سے کبیدہ خاطر ہوتے تو خدیجۃ الکبریٰ عرض کرتیں: ”یا رسول اللہؐ آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ بھلا کوئی ایسا رسول بھی آج تک آیا ہے جس سے لوگوں نے تمسخر نہ کیا ہو“۔ حضرت خدیجہؓ کے اس کہنے سے حضورؐ کا ملالِ طبع دور ہو جاتا تھا۔ غرض اس پر آشوب زمانے میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نہ صرف حضورؐ کی ہم خیال اور نمگسار تھیں بلکہ ہر موقع پر اور ہر مصیبت میں آپؐ کی مدد کے لیے تیار رہتی تھیں۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے:

”میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور مجھ کو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو میں خدیجہؓ سے کہتا۔ وہ اس طرح میری ڈھارس بندھاتی تھیں کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی، اور کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہؓ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا تھا“۔

عقیف کنڈی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں زمانہٴ جاہلیت میں کچھ اشیاء

خریدنے کے لیے مکہ آیا اور عباس بن عبدالمطلب کے پاس ٹھہرا۔ دوسرے دن صبح کے وقت عباس کے ہمراہ بازار کی طرف چلا۔ جب کعبہ کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان شخص آیا۔ اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر دیکھا اور پھر قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نونیز لڑکا آیا جو پہلے جوان کی ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک عورت آئی اور وہ بھی ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی، ان تینوں نے نماز پڑھی اور چلے گئے۔ میں نے عباس سے کہا۔ ”عباس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں انقلاب آنے والا ہے۔“ عباس نے کہا۔ ”ہاں، تم جانتے ہو یہ تینوں کون ہیں؟“ میں نے کہا ”نہیں۔“ عباس نے کہا۔ ”یہ جوان اور لڑکا دونوں میرے بھتیجے ہیں، جوان عبداللہ بن عبدالمطلب کا بیٹا محمد اور لڑکا ابوطالب بن عبدالمطلب کا بیٹا علی تھا۔ عورت جس نے دونوں کے پیچھے نماز پڑھی میرے بھتیجے محمد کی بیوی خدیجہ بنت خویلد ہے۔ میرے بھتیجے کا دعویٰ ہے کہ اس کا دین الہامی ہے اور وہ ہر کام خدا کے حکم سے کرتا ہے، لیکن ابھی تک ان تینوں کے سوا کوئی اس دین کا پیرو میرے علم میں نہیں ہے۔“ عباس کی یہ باتیں سن کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اے کاش چوتھا میں ہوتا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے کیسے نامساعد حالات میں سرور کائنات ﷺ کا ساتھ دیا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی یہی ہمدردی، دلسوزی اور جاں نثاری تھی کہ حضور ان سے بے پناہ محبت فرماتے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہیں حضور نے کوئی دوسرا نکاح نہ فرمایا۔ حضرت خدیجہؓ جہاں اولاد کی پرورش نہایت حسن و خوبی سے کر رہی تھیں وہاں امور خانہ داری کو بھی نہایت سلیقہ سے نباہتی تھیں اور باوجود تمول و ثروت کے حضور کی خدمت خود

کرتی تھیں۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ حضورؐ کے پاس تشریف لائے اور کہا۔ ”خدیجہؓ برتن میں کچھ لا رہی ہیں آپ ان کو اللہ کا اور میرا سلام پہنچا دیجئے۔“

سرورِ عالم ﷺ سے حضرت خدیجہؓ کی عقیدت اور محبت کی یہ کیفیت تھی کہ بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد حضورؐ نے جو کچھ فرمایا انہوں نے ہمیشہ اس کی پرزور تائید و تصدیق کی۔ اسی لیے حضورؐ ان کی بے حد تعریف و تحسین فرمایا کرتے تھے۔

۷۔ بعد بعثت میں مشرکین قریش نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کیا تو حضرت خدیجہؓ بھی اس ابتلا میں سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ تھیں، وہ پورے تین برس تک اس محصوری کے روح فرسا آلام و مصائب بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ جھیلتی رہیں۔

۱۰۔ بعد بعثت میں یہ ظالمانہ محاصرہ ختم ہوا لیکن اس کے بعد حضرت خدیجہ الکبریٰؓ زیادہ دن زندہ نہ رہیں۔ رمضان المبارک میں (یا اس سے کچھ پہلے) ان کی طبیعت ناساز ہوئی۔ حضورؐ نے علاج معالجہ اور تسکین و تشفی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن موت کا کوئی علاج نہیں۔ ۱۰ رمضان ۱۰ نبویؐ کو انہوں نے پیک اجل کو لبیک کہا اور مکہ کے قبرستان حجون میں دفن ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۶۵ برس کی تھی۔

حضور ﷺ کو ان کی وفات کا بے پناہ صدمہ ہوا اور آپؐ اکثر ملول رہنے لگے تا آنکہ حضرت سودہؓ سے آپؐ کا نکاح ہو گیا۔

حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد بھی آپؐ کو ان سے اتنی محبت تھی کہ جب کوئی قربانی کرتے تو پہلے حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو گوشت بھیجتے اور بعد میں کسی اور کو دیتے۔ حضرت خدیجہؓ کا کوئی رشتہ دار جب کبھی آپؐ کے پاس آتا

تو آپ اس کی بجد خاطر مدارات فرمایا کرتے۔

رحلتِ خدیجۃ الکبریٰ کے بعد مدت تک حضور اس وقت تک گھر سے باہر تشریف نہ لے جاتے جب تک حضرت خدیجہؓ کی اچھی طرح تعریف نہ کر لیتے۔ اسی طرح جب گھر تشریف لاتے تو ان کا ذکر کر کے بہت کچھ تعریف فرماتے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضور نے حسب معمول خدیجۃ الکبریٰ کی تعریف کرنی شروع کی۔ مجھے رشک آیا، میں نے کہا ”یا رسول اللہ وہ ایک بڑھیا بیوہ عورت تھیں خدا نے ان کے بعد آپ کو اس سے بہتر بیوی عنایت کی“۔ یہ سن کر حضور کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا اور فرمایا: ”خدا کی قسم مجھے خدیجہؓ سے اچھی بیوی نہیں ملی۔ وہ ایمان لائیں جب سب لوگ کافر تھے۔ اس نے میری تصدیق کی جب سب نے مجھے جھٹلایا۔ اس نے اپنا زر و مال مجھ پر قربان کر دیا۔ جب دوسروں نے مجھے محروم رکھا اور اللہ نے اس کے بطن سے مجھے اولاد دی“۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں ڈر گئی اور اس روز سے عہد کر لیا کہ آئندہ حضور کے سامنے کبھی خدیجۃ الکبریٰ کو ایسا ویسا نہ کہوں گی۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے حضور کو چھ لڑکے لڑکیاں دیں۔ سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے جو کمسنی میں انتقال کر گئے۔ پھر زینبؓ، ان کے بعد عبداللہؓ، وہ بھی صغریٰ میں فوت ہو گئے (ان کا لقب طیب اور طاہر تھا) پھر رقیہؓ، پھر اُم کلثومؓ پھر فاطمہؓ الزہراءؓ پیدا ہوئیں۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مناقب میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔

(رضی اللہ تعالیٰ عنہا)

رسولِ پاک ﷺ کی اولادِ اطہار

جمہور مسلمین اس بات پر متفق ہیں کہ سرورِ عالم ﷺ کے تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

صاحبزادے

(۱) حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

انہی کی نسبت سے حضور ﷺ کی کنیت ابوالقاسم ہوئی۔ قبل از نبوت متولد ہوئے اور ایک سال پانچ ماہ کی عمر میں وفات پائی۔

(۲) حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ان کا قلب طاہر و طیب تھا۔ حضور کی بعثت کے بعد پیدا ہوئے اور صغریٰ میں فوت ہو گئے۔

(۳) حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۸ ہجری میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ وہ بھی کمسنی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

صاحبزادیاں

(۱) حضرت زینبؓ۔

(۲) حضرت رقیہؓ۔

(۳) حضرت اُمّ کلثومؓ۔

(۴) حضرت فاطمہؓ الزہراءؓ۔

حضرت ابراہیمؑ کے سوا حضور ﷺ کی ساری اولاد آپؐ کی سب سے پہلی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن مبارک سے ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ حضرت ماریہ قبطیہؓ تھیں۔

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی صلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ گیلٹر (لے پالک یا ربائب) تھیں۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہے۔ سورۃ الاحزاب میں حضورؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ
عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ط

(اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکالیا کریں)

لفظ بنات جمع قلت ہے جس سے حضورؐ کی کئی بیٹیاں ثابت ہوتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ کئی بیٹیاں تھیں بلکہ وہ جوان عاقلہ وبالغہ تھیں کیونکہ اس آیت میں احکام تکلیفیہ بیان ہو رہے ہیں اور عورتوں کو پردہ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ تمام مستند اور معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن مبارک سے حضورؐ کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضورؐ کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تھیں خود ان کی کتابوں سے آپؐ کی چار صاحبزادیاں ثابت ہوتی ہیں اس کے باوجود وہ طرح طرح کی تاویلیں کر کے اس بات پر مصر ہیں کہ حضورؐ کی صرف ایک بیٹی تھی اور باقی تینوں بنات طاہرات کا باپ کوئی اور تھا رسول اللہ ﷺ نہیں تھے (معاذ اللہ) — اولاد رسولؐ کے نسب سے انکار کرنا نہایت مکروہ جرم اور سخت گناہ ہے۔ کوئی صحیح العقیدہ مسلمان قرآن

کریم کی نص صریح اور معتبر روایات کی روشنی میں ایسا لایعنی اور بے بنیاد دعویٰ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

صاحبزادیوں کی ترتیب ولادت

سرورِ عالم ﷺ کی صاحبزادیوں کی تعداد پر تو تمام معتبر روایات متفق ہیں البتہ ان کی ترتیب ولادت کے بارے میں بعض روایتوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ ابن سعد اور ابن عساکر نے ان کی ترتیب ولادت اس طرح بیان کی ہے:

(۱) حضرت زینبؓ

(۲) حضرت اُمّ کلثومؓ

(۳) حضرت فاطمہؓ

(۴) حضرت رقیہؓ

ابن حزم اور حافظ ذہبی کے نزدیک حضورؐ کی صاحبزادیوں کی ترتیب ولادت

یہ ہے:

(۱) حضرت زینبؓ۔

(۲) حضرت رقیہؓ

(۳) حضرت فاطمہؓ

(۴) حضرت اُمّ کلثومؓ

حافظ ابن عبدالبر اور بہت سے دوسرے علماء مؤرخین نے ان کی ترتیب

ولادت اس طرح بیان کی ہے:

(۱) حضرت زینبؓ

(۲) حضرت رقیہؓ

(۳) حضرت اُمّ کلثومؓ

(۴) حضرت فاطمہؓ

جمہور ارباب علم نے اسی ترتیب کو ترجیح دی ہے اس کے مطابق حضرت فاطمہؓ حضورؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں ”اردو دائرۃ معارف اسلامیہ“ میں ہے کہ:

”عربوں میں رسم اور عادت یہ ہے کہ جب تک بڑی بہن کی شادی نہ ہو جائے، چھوٹی بہن کی شادی نہیں ہوتی۔ حضرت فاطمہؓ کی بہنوں میں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ اور حضرت اُمّ کلثومؓ کی شادی حضرت فاطمہؓ کی شادی سے پہلے ہوئی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ رسول اللہ ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔

(دیکھئے ابن عبد البر: الاستیعاب ۴: ۳۷۳ برہامش الاصابہ مصر ۱۳۲۳ھ)

اردو دائرۃ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور۔ جلد ۱۵ ص ۹۰)



سیدہ فاطمہؑ الرّٰہِیّۃ کی بہنیں

- حضرت زینب بنت رسول اللہ ﷺ
- حضرت رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ
- حضرت امّ کلثوم بنت رسول اللہ ﷺ

حضرت سیدہ زینب بنت رسول اللہ ﷺ

حضرت سیدہ زینب بنت رسول اکرم ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ وہ بعثت نبوی سے دس سال پہلے مکہ معظمہ میں اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بطن مبارک سے پیدا ہوئیں۔ رسول کریم ﷺ کی عمر مبارک اس وقت تیس برس کی تھی۔

سیدہ زینب کی شادی کمسنی (بعثت نبوی سے قبل) ان کے خالہ زاد بھائی ابو العاص بن ربیع (بن عبدالعزیٰ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی) کے ساتھ ہوئی۔ سرور کونین ﷺ منصب رسالت پر فائز ہوئے تو حضرت زینب اپنی جلیل القدر والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی تقلید میں فوراً ایمان لے آئیں۔

بعثت کے بعد جب توحید کی دعوت عالم کا آغاز ہوا تو کفار مکہ نے سرور کائنات ﷺ اور دعوت حق پر لپیک کہنے والوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے شروع کر دیئے۔ سیدہ زینب اپنے پدر گرامی ﷺ اور دوسرے اہل حق سے کفار کی بدسلوکی دیکھتیں تو ان کو بہت دکھ ہوتا۔ حارث (بروایت دیگر حرث) عامری کا بیان ہے کہ میں اور میرے والد حج کرنے کے لیے مکہ گئے۔ منیٰ میں ہم نے ایک بڑا مجمع دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لوگوں نے ایک صابی (نعوذ باللہ) کے پاس ہجوم کر رکھا ہے (زمانہ بعثت میں مشرکین مکہ، سرور عالم ﷺ اور دوسرے اہل حق کو صابی یعنی بد مذہب کہا کرتے تھے) حارث کہتے ہیں کہ ہم بھی مجمع میں گئے اور دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے ہیں اور مشرکین نہ صرف

آپ کی ہر بات کاٹتے جاتے ہیں بلکہ آپ کو گالیاں اور دھکے دے رہے ہیں۔ جب بہت سادہ چڑھ آیا تو ایک خاتون جس کے ہاتھ میں پانی کا برتن اور رومال تھا وہاں آئی اور اس بدسلوکی کو دیکھ کر جو مشرکین کا مجمع آپ سے کر رہا تھا، رونے لگی۔ آپ نے اس سے پانی لے کر وضو کیا پھر خاتون سے کہا، ”بیٹی صبر کرو اور اپنے باپ کے ستائے جانے کا کچھ خیال نہ کرو یہ دن ہمیشہ اسی طرح نہیں رہیں گے۔“

میں نے دریافت کیا کہ یہ خاتون کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی زینب ہیں۔ (بخاری فی تاریخہ و طبرانی)

ایک اور صاحب منبت بن مدرک الازدی سے روایت ہے کہ قبول اسلام سے پہلے میں اور میرا والد حج کو گئے۔ جب منیٰ میں پہنچے تو ایک مجمع نظر آیا۔ وہاں جا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک صابی ہے جس نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے۔ میں اور میرا باپ اونٹ پر سوار تھے۔ ہم دونوں اپنے اونٹ ہجوم کے پیچھے لے گئے اور وہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس کو دیکھنے لگے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو سمجھاتے تھے اور مشتعل ہجوم نہایت ذلیل حرکتیں کر رہا تھا۔ کوئی شخص آپ پر تھوک رہا تھا، کوئی گالیاں بک رہا تھا اور کوئی پتھر، کنکر اور ڈھیلے پھینک رہا تھا۔ لیکن آپ ان کی ایذا رسانی کے باوجود توحید کی خوبیاں بیان فرما رہے تھے۔ بہت دیر اسی کشمکش میں گزر گئی۔ آخر ایک لڑکی پانی کا ایک برتن لے کر آئی۔ وہ آپ کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔ لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ آپ کی صاحبزادی زینبؓ ہیں۔ آپ نے صاحبزادی سے فرمایا، بیٹی مت رو اور اپنے باپ کے بارے میں کسی قسم کا خدشہ دل میں نہ ڈال۔ (کنز العمال بحوالہ ابن عساکر)

حضورؐ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت اُمّ کلثومؓ ابولہب کے دو بیٹوں کے نکاح میں تھیں۔ انہوں نے اپنے باپ کے کہنے پر دونوں صاحبزادیوں

کو (رخصتی سے پہلے) طلاق دے دی۔ کفار نے ابوالعاص کو بھی بہت اکسایا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور حضرت زینبؓ سے نہایت اچھا سلوک کرتے رہے۔ حضورؐ نے ابوالعاصؓ کے اس طرزِ عمل کی ہمیشہ تعریف فرمائی۔ باوجود اتنی شرافت اور نیک نفسی کے ابوالعاصؓ بعض موانع کی بناء پر اپنا آبائی مذہب ترک نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ رسولِ کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ حضرت زینبؓ ان دنوں اپنے سسرال میں تھیں۔

رمضان المبارک ۲ ہجری میں بدر کے میدان میں حق اور باطل کے درمیان پہلا معرکہ ہوا، اس میں حق غالب رہا اور قریشِ مکہ کے بہت سے آدمی مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے، ان میں ابوالعاصؓ بھی تھے۔ انہیں ایک انصاری حضرت عبداللہ بن جبیر نے اسیر کیا۔ اہل مکہ نے جب یہ خبر سنی تو انہوں نے اپنے قرابت دار قیدیوں کی رہائی کے لیے حضورؐ کی خدمت میں زرفدیہ بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے بھی مکہ سے اپنے دیور عمرو بن ربیع کے ہاتھ یمنی عقیق کا وہ ہار اپنے شوہر کی رہائی کے لیے بھیجا جو انہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے شادی کے وقت بطور تحفہ دیا تھا۔ جب سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں یہ ہار پیش کیا گیا تو حضورؐ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ یاد آ گئیں اور آپؐ آبدیدہ ہو گئے۔ پھر آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا ”اگر مناسب سمجھو تو یہ ہار زینب کو واپس بھیج دو یہ اس کی ماں کی نشانی ہے۔ ابوالعاص کا فدیہ صرف یہ ہے کہ وہ مکہ جا کر زینب کو فوراً مدینہ بھیج دیں۔“ تمام صحابہؓ نے ارشادِ نبوی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ ابوالعاص نے بھی یہ شرط قبول کر لی اور رہا ہو کر عازمِ مکہ ہو گئے۔

مکہ پہنچ کر ابوالعاص نے حسبِ وعدہ حضرت زینبؓ کو اپنے چھوٹے بھائی کنانہ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ کر دیا۔ کفارِ مکہ کہ معلوم ہوا کہ رسول

اکرم ﷺ کی بیٹی مدینہ جا رہی ہے تو انہوں نے کنانہ بن ربیع اور حضرت زینبؓ کا تعاقب کیا اور مقام ”ذی طوی“ میں انہیں جا گھیرا۔ حضرت زینبؓ اونٹ پر سوار تھیں، کفار کی جماعت میں سے ایک ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو اپنے نیزے سے زمین پر گرا دیا، وہ امید سے تھیں، سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا، اس پر کنانہ نے غضبناک ہو کر ترکش سے تیر نکالے اور انہیں کمان پر چھڑا کر کفار کو لکارا کہ خبردار اب تم میں سے کوئی آگے بڑھا تو اسے چھلنی کر ڈالوں گا، اسی اثناء میں وہاں رئیس قریش ابوسفیان آگئے، انہوں نے کنانہ سے کہا، بھتیجے اپنے تیر روک لو میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔

کنانہ نے پوچھا ”کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“

ابوسفیان نے کنانہ کے کان میں کہا ”محمدؐ کے ہاتھوں ہمیں جس ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے تم اس سے بخوبی آگاہ ہو، اگر تم اس کی بیٹی کو اس طرح کھلم کھلا ہمارے سامنے لے جاؤ گے تو ہماری بڑی سبکی ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس وقت زینبؓ کے ہمراہ مکہ واپس آ جاؤ اور پھر کسی وقت خفیہ طور پر زینبؓ کو لے جانا۔“ کنانہ نے یہ بات مان لی اور حضرت زینبؓ کو لے کر مکہ واپس آ گئے۔ چند دن بعد وہ رات کے وقت چپکے سے حضرت زینبؓ کو ساتھ لے کر بطن یا حج کے مقام پر پہنچے جہاں محبوب رسولؐ حضرت زیدؓ بن حارثہ حضورؐ کے حکم کے مطابق حضرت زینبؓ کی پیشوائی کے لیے مدینہ سے آئے ہوئے تھے۔ کنانہ حضرت زینبؓ کو حضرت زیدؓ بن حارثہ کے سپرد کر کے مکہ واپس چلے گئے اور حضرت زیدؓ سیدہ زینبؓ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

ابوالعاص کو حضرت زینبؓ سے بہت محبت تھی، سیدہ کے چلے جانے کے بعد وہ بہت بے چین رہنے لگے۔ ایک دفعہ جب وہ شام کی طرف سفر کر رہے تھے تو پردرد آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

ذکرت زینب لها ورکت ارما فقلت سقیاً لشخص یسکن الحرما
 بنت الامین جزها اللہ صالحہ وکل بعل یشنی ما الذی علما
 (جب میں ارم کے مقام سے گزرا تو زینب کو یاد کیا اور کہا خدا اس
 شخص کو شاداب رکھے جو حرم میں مقیم ہے، امین کی بیٹی کو خدا جزائے
 خیر دے اور ہر خاوند اسی بات کی تعریف کرتا ہے جس کو وہ خوب جانتا
 ہے۔)

ابوالعاص بڑے شریف النفس اور دیانت دار آدمی تھے۔ لوگ ان کے پاس
 اپنی امانتیں رکھتے اور وہ نہایت دیانت کے ساتھ ان کی حفاظت کرتے اور مالکوں
 کے طلب کرنے پر فوراً واپس دے دیتے۔ مکے میں ان کی اس قدر ساکھ تھی کہ
 لوگ بلا کھٹکے بلکہ بڑے اصرار کے ساتھ اپنا مال تجارت انہیں دے کر فروخت
 کرنے کے لیے دوسرے ملکوں کو بھیجا کرتے تھے۔ ۶ ہجری میں ابوالعاص ایک
 تجارتی قافلہ لے کر شام جا رہے تھے کہ عیص کے مقام پر مجاہدین اسلام نے اس
 قافلے پر چھاپہ مارا اور تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ قافلہ کے تمام محافظین بھی
 مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے البتہ ابوالعاص کسی طرح بچ نکلے اور مدینہ منورہ
 پہنچ کر حضرت زینب کی پناہ لے لی۔ سیدہ نے حضور سے سفارش کی کہ ابوالعاص کا
 مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ چونکہ ابوالعاص نے مکہ میں حضرت زینب سے اچھا
 سلوک کیا تھا اس لیے حضور ان کا لحاظ کرتے تھے آپ نے صحابہ سے فرمایا:
 ”اگر تم ابوالعاص کا مال واپس کر دو تو یہ تمہارا احسان ہوگا۔“

صحابہ کرام کو تو ہر وقت خوشنودی رسول مطلوب تھی، فوراً تمام مال و اسباب
 ابوالعاص کو واپس کر دیا۔ وہ اسے لے کر مکہ پہنچے اور تمام لوگوں کی امانتیں واپس کر
 دیں۔ پھر اہل مکہ سے مخاطب ہو کر کہا:

”اے اہل قریش اب میرے ذمہ کسی کی کوئی امانت تو نہیں ہے؟“

تمام اہل مکہ نے یک زبان ہو کر کہا، ”بالکل نہیں۔ لات و ہبل کی قسم تم ایک نیک نہاد اور با وفا شخص ہو۔“

حضرت ابوالعاصؓ نے کہا، ”تو سن لو کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ واللہ اسلام قبول کرنے میں مجھے صرف یہ بات مانع تھی کہ تم لوگ مجھے خائن نہ سمجھو۔“
یہ کہہ کر کلمہ شہادت پڑھا اور اس کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔

حضرت زینبؓ نے ابوالعاصؓ کو حالت شرک میں چھوڑا تھا اس لیے دونوں میں باہم تفریق ہو گئی تھی چنانچہ حضرت ابوالعاصؓ مشرف بہ اسلام ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو حضورؐ نے حضرت زینبؓ اور حضرت ابوالعاصؓ کے نکاح کی تجدید فرمائی۔ تاہم شرائط نکاح اور حق مہر میں کوئی تبدیلی نہ کی۔

حضرت زینبؓ اس واقعہ کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہیں اور ۸ ہجری میں خالق حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔ اس کا سبب وہی تکلیف تھی جو ہجرت کے موقع پر انہیں اونٹ سے گر جانے کی وجہ سے پہنچی تھی۔ حضرت اُمّ ایمنؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت اُمّ سلمہؓ نے سرورِ عالم ﷺ کی ہدایت کے مطابق غسل دیا۔ جب غسل سے فارغ ہوئیں اور حضورؐ کو اطلاع دی تو آپؐ نے اپنی تہ مبارک عنایت فرمائی اور ہدایت کی کہ اسے کفن کے اندر زینب کو پہنا دو۔

صحیح بخاری میں مشہور صحابیہ حضرت اُمّ عطیہؓ سے روایت ہے کہ میں بھی زینب بنت رسول اللہ (ﷺ) کے غسل میں شریک تھی۔ غسل کا طریقہ رسول اکرم ﷺ خود بتلاتے جاتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، پہلے ہر عضو کو تین بار یا پانچ بار غسل دو اور اس کے بعد کافور لگاؤ۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت اُمّ عطیہؓ سے فرمایا:

”اے اُمّ عطیہ میری بیٹی کو اچھی طرح کفن میں لپیٹنا۔ اس کے بالوں

کی تین چوٹیاں بنانا اور اسے بہترین خوشبوؤں سے معطر کرنا۔
 نمازِ جنازہ رحمتِ عالم ﷺ نے خود پڑھائی۔ حضرت ابوالعاصؓ نے قبر میں اتارا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ بھی قبر میں اترے۔
 جس دن سیدہ نے وفات پائی حضورؐ بے حد مغموم تھے۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور آپؐ فرما رہے تھے ”زینب میری بہت اچھی لڑکی تھی جو میری محبت میں ستائی گئی“۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا، زینب بڑی کمزور اور ناتواں تھی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس کو قبر کی تنگی اور گھٹن سے محفوظ کر دیا ہے۔

حضرت ابوالعاصؓ سے حضرت زینبؓ کے دو بچے ہوئے ایک لڑکا علیؓ اور ایک لڑکی اُمّہؓ۔ علیؓ کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق وہ بچپن میں فوت ہو گئے، دوسری روایت یہ ہے کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچنے سے پہلے اپنے والد ابوالعاصؓ کے سامنے فوت ہوئے۔ فتح مکہ کے موقع پر وہ حضورؐ کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے (یعنی آپؐ کے ردیف تھے) تیسری روایت میں ہے کہ وہ جنگِ یرموک تک زندہ رہے اور اسی لڑائی میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

حضرت اُمّہؓ طویل عرصہ تک زندہ رہیں۔ سرورِ عالم ﷺ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ اس حالت میں مسجد میں تشریف لائے کہ ننھی اُمّہؓ شانہ مبارک پر سوار تھیں۔ آپؐ رکوع میں جاتے تو ان کو اتار دیتے پھر جب سجدہ کے بعد کھڑے ہوتے تو پھر کندھے پر بٹھا لیتے تھے اسی طرح پوری نماز ادا فرمائی۔

ایک دفعہ کہیں سے تحفہ میں ایک قیمتی ہار آیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ ہار میں اس کو دوں گا جو میرے اہل خانہ میں مجھ کو سب سے محبوب ہوگا۔ ازواجِ مطہرات کو

خیال ہوا کہ شاید یہ ہار حضرت عائشہ صدیقہ کو مرحمت ہو لیکن آپ نے حضرت
 امامہؓ کو بلایا اور وہ ہاران کے گلے میں ڈال دیا۔

(أَسَدُ الْغَابَةِ لابن اشیر، الاستیعاب لابن عبدالبر)

بعض روایتوں میں ہے کہ شاہِ حبشہ نجاشی نے ایک انگوٹھی حضورؐ کی خدمت
 میں ہدیہ بھیج تھی۔ آپ نے یہ انگوٹھی حضرت امامہؓ کی انگلی میں پہنا دی۔

رحمتِ عالم ﷺ کی رحلت کے چند ماہ بعد جب حضرت فاطمہؑ الزہراءؑ نے
 وفات پائی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت امامہؓ سے نکاح کر لیا۔ ۳۰ھ میں
 حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد وہ مغیرہ بن نوفل کے نکاح میں
 آئیں۔ ان کی صلب سے ایک لڑکا یحییٰ پیدا ہوا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت
 امامہؓ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت امامہؓ کا انتقال مغیرہ ہی کے گھر میں ہوا۔

حافظ ابن عبدالبر نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ حضرت زینبؓ کے شوہر

حضرت ابوالعاصؓ نے ۱۳ھ میں وفات پائی۔



حضرت سیدہ رقیہؓ بنت رسول اللہ ﷺ

حضرت سیدہ رقیہؓ سرورِ کونین ﷺ کی دوسری صاحبزادی تھیں۔ جو بعثتِ نبویؐ سے سات سال پہلے اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن مبارک سے پیدا ہوئیں۔

سیدہ رقیہؓ کا پہلا نکاح اپنے ابن عم عتبہ بن ابی لہب سے ہوا۔ حضورؐ کے اعلان کے بعد (اور بعض روایتوں کے مطابق سورہ تبتّ یدآ ابی لہب کے نزول کے بعد) عتبہ نے اپنے باپ ابی لہب کے حکم کے مطابق حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دی ان کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد سرورِ کونین ﷺ نے حضرت عثمان بن عفان کو اپنی دامادی لے یہی عتبہ فتح مکہ کے موقع پر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ ان کے بھائی معتب بن ابی لہب نے بھی اسی موقع پر اسلام قبول کر لیا۔

علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ دونوں بھائیوں کے سعادت اندوزِ اسلام ہونے پر سرورِ عالم ﷺ کو بے حد مسرت ہوئی۔ آپ دونوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باب کعبہ اور حجرِ اسود کے درمیان لے گئے۔ اور کچھ دعا کی۔ اس وقت حضورؐ کا روئے انور فرطِ مسرت سے چمک رہا تھا۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آپ بہت خوش نظر آتے ہیں؟“ فرمایا۔ ”میں نے اپنے ان بھائیوں کو اللہ سے مانگا تھا اس نے مجھے دے دے دیے اسی لیے میں خوش ہوں۔“

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عتبہؓ غزوہ حنین اور غزوہ طائف میں شریک ہوئے اور بڑی پامردی سے لڑے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عتبہؓ بن ابی لہب نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

کے لیے منتخب فرمایا۔ وہ بنو امیہ کے ایک ممتاز فرد تھے اور نہایت اعلیٰ اوصاف و خصائل سے متصف تھے۔ ان کی اپنی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ انہیں حضورؐ کا خویش بننے کا شرف حاصل ہو۔ چنانچہ حضورؐ نے حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کر دی۔

مکہ میں جب کفار نے مسلمانوں کو بے حد ستایا تو حضورؐ نے انہیں حبش کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵ھ نبوت میں کچھ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ بھی حضرت رقیہؓ کے ہمراہ حبش کو ہجرت کر گئے۔ حضورؐ کو ان کی ہجرت حبشہ کی خبر ملی تو آپؐ نے فرمایا:

”ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ ہجرت کی ہے۔“

چند ماہ بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ حبش سے مکہ واپس آ گئے لیکن کفار کی ایذا رسانیاں پہلے سے بھی بڑھ گئی تھیں۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی بہت سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ دوبارہ حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ عرصہ تک حضورؐ کو ان کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی تو آپؐ بہت متفکر ہوئے۔ ایک دن کسی عورت نے آ کر خبر دی کہ میں نے عثمانؓ اور رقیہؓ کو بچشم خود حبش میں بخیریت دیکھا ہے۔ حضورؐ کو اطمینان ہو گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس موقع پر بھی آپؐ نے فرمایا:

”اللہ دونوں پر رحم فرمائے، عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ہجرت کی۔“

کافی عرصہ بعد حبش میں قیام کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کو خبر ملی کہ رسول اکرم ﷺ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ وہ کچھ دوسرے مسلمانوں اور حضرت رقیہؓ کے ہمراہ حبش سے مکہ واپس آ گئے اور پھر چند دن کے بعد حضورؐ کی اجازت سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں حضرت

اوس بن ثابت کے گھرا ترے۔ ۲۔ ہجری میں جب حضورؐ غزوہ بدر کے لیے روانہ ہو رہے تھے، حضرت رقیہؓ کو چچک نکل آئی، آپ نے حضرت عثمانؓ کو حکم دیا کہ وہ رقیہؓ کی خبر گیری کے لیے مدینہ ہی میں ٹھہریں اس کے عوض اللہ تعالیٰ انہیں جہاد میں شریک ہونے کا ثواب بھی دے گا اور مالِ غنیمت میں سے بھی انہیں حصہ ملے گا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ مدینہ منورہ میں ہی ٹھہر گئے۔ رسول کریم ﷺ نے ابھی بدر سے مراجعت نہیں فرمائی تھی کہ حضرت رقیہؓ کی تکلیف بڑھ گئی اور انہوں نے اکیس سال کی عمر میں پیک اجل کو لبیک کہا۔ عین اس وقت جب قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی، حضرت زید بن حارثہ فتح بدر کی خوشخبری لے کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ سرورِ عالم ﷺ کو اپنی لختِ جگر کی وفات کی اطلاع ملی تو آپ کو سخت صدمہ پہنچا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مدینہ منورہ واپس پہنچ کر آپ حضرت رقیہؓ کی قبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

”عثمان بن مظعون جا چکے اب تم بھی ان سے جا ملو“۔ (عثمان بن مظعون پہلے مہاجر تھے جنہوں نے مدینہ آ کر وفات پائی تھی) حضورؐ کے اس ارشاد پر عورتوں میں کہرام مچ گیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں سختی سے منع کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، ”عمر انہیں رونے دو، دل اور آنکھ کے رونے میں کوئی حرج نہیں البتہ نوحہ و بین سے بچنا چاہیے کہ یہ شیطانی حرکت ہے“۔

حضرت سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ بھی اپنی بہن کی قبر پر تشریف لائیں اور قبر کے کنارے بیٹھ کر رونے لگیں۔ حضورؐ اپنی چادر مبارک کے کناروں سے ان کے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

حضرت رقیہؓ کے قیامِ حبش کے دوران میں ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اسی صاحبزادے کی نسبت سے حضرت عثمانؓ کی کنیت ابو عبداللہ مشہور ہوئی۔ سیدہ رقیہؓ نے وفات پائی تو عبداللہؓ صرف چار برس کے

تھے۔ دو برس بعد ان کو ایک حادثہ پیش آیا۔ ایک مرغ نے ان کی آنکھ میں چونچ مار دی جس سے سارا چہرہ متورم ہو گیا۔ اسی تکلیف سے انہوں نے جمادی الاولیٰ ۴ھ میں وفات پائی۔ حضورؐ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت عثمانؓ نے قبر میں اتارا۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ میں باہم بیحد محبت تھی۔ ان کے تعلقات اتنے خوشگوار اور مثالی تھے کہ لوگوں میں ان کی نسبت یہ مقولہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا:

”احسن الزوجین راہما الانسان رقیہؓ وزوجها عثمانؓ“
یعنی رقیہؓ اور عثمانؓ سے بہتر میاں بیوی کسی انسان نے نہیں دیکھے۔



حضرت سیدہ اُمّ کلثوم بنت رسول اللہ ﷺ

حضرت سیدہ اُمّ کلثوم سرورِ کونین ﷺ کی تیسری صاحبزادی ہیں۔ بعض اہل سیر نے ان کا نام امیہ لکھا ہے لیکن انہوں نے اپنی کنیت اُمّ کلثوم سے شہرت پائی۔ حضرت اُمّ کلثوم بعثتِ نبوی سے چھ سال قبل اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بطن مبارک سے پیدا ہوئیں۔ وہ حضرت رقیہ سے ایک سال چھوٹی اور سیدہ فاطمۃ الزہراء سے ایک سال بڑی تھیں۔

حضرت اُمّ کلثوم کا نکاح بعثتِ نبوی سے پہلے اپنے ابن عم عتیبہ بن ابولہب سے ہوا۔ بعثتِ نبوی کے چند سال بعد جب سورہ تَبَّتْ یَدَا اَبی لَهَبٍ نازل ہوئی تو ابولہب کو سخت غصہ آیا۔ اس کے ایک بیٹے عتبہ کے نکاح میں رقیہ بنت رسول اللہ تھیں اور دوسرے بیٹے عتیبہ سے حضرت اُمّ کلثوم کا نکاح ہوا تھا (لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی) ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلایا اور ان سے کہا:

”میرا اٹھنا بیٹھنا تمہارے ساتھ حرام ہے اگر تم نے اس محمد (ﷺ) کی لڑکیوں کو طلاق نہ دی۔“

دونوں بیٹوں نے بد بخت باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ عتبہ نے سیدہ رقیہ کو اور عتیبہ نے سیدہ اُمّ کلثوم کو طلاق دے دی۔ (رخصتی سے پہلے) بعض روایتوں میں ہے کہ یہ واقعہ حضور کے اعلانِ نبوت کے بعد (اور سورہ

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ كَمَا نَزَلَ مِنْ سَمَاءٍ (پہلے سے پہلے) پیش آیا

واقعہ طلاق کے بعد حضرت رقیہؓ حضرت عثمان غنیؓ کے عقد نکاح میں آئیں۔

۲ ہجری میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کو ان کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ اسی زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ بیوہ ہو گئیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ حضرت حفصہؓ سے نکاح کر لیں لیکن انہوں نے تامل کیا۔ رسول اکرم ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ میں تم کو حفصہؓ کے لیے عثمانؓ سے بہتر شخص کا پتہ دیتا ہوں اور عثمانؓ کے لیے حفصہؓ سے بہتر رشتہ بتاتا ہوں۔ پھر فرمایا، حفصہؓ کا نکاح مجھ سے کرو اور میں اپنی بیٹی کی شادی عثمانؓ سے کر دیتا ہوں جو رقیہؓ کے فوت ہو جانے سے بہت دل گرفتہ ہے۔ حضرت عمرؓ فوراً رضامند ہو گئے۔ چنانچہ حضرت حفصہؓ کا نکاح رسول اکرم ﷺ سے ہو گیا اور حضرت اُمّ کلثومؓ کا نکاح حضورؐ نے حضرت عثمانؓ سے پڑھا دیا۔ حق مہر وہی مقرر ہوا جو حضرت رقیہؓ کا تھا۔

حضرت اُمّ کلثومؓ اس نکاح کے بعد چھ سال تک زندہ رہیں۔ شعبان ۹

ہجری میں انہوں نے وفات پائی تو رسول اکرم ﷺ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپؐ کی

اعتیہ بھی اپنے والد کی طرح سخت اسلام دشمن تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنی وراثت طبع کا مظاہرہ اس طرح کیا

کہ رسول اکرم ﷺ کے پاس جا کر کہنے لگا میں ”الْتَجَمَ إِذَا هَوَىٰ أَوِ الْذِي دَنَا فَتَدَلَّىٰ كَأَنكَارَ كَرْتَا هُونَ“۔

بدبخت نے یہی کہنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ حضورؐ کی طرف تھوکا جو آپؐ پر پڑا نہیں۔ سرور عالم ﷺ کو اس کی یہ

حرکت سخت ناگوار گزری اور آپؐ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آ گئے۔

”الہی اس پر اپنے کٹوں میں سے ایک ٹکٹے کو مسلط کر دے۔“

اس واقعہ کے بعد عتیہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوا۔ اثنائے سفر میں قافلے نے ایک

ایسی جگہ قیام کیا جہاں رات کو درندے آتے تھے۔ وہاں کے باشندوں نے ابولہب کو اس خطرہ سے آگاہ کیا تو

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ عتیہ کی حفاظت کا اچھی طرح انتظام کریں کیونکہ مجھے محمد (ﷺ) کی بددعا

سے خوف آتا ہے۔ اس پر اہل کاروان نے عتیہ کے چاروں طرف اپنے اونٹ بٹھا دیئے اور سو گئے۔ رات کو

ایک شیر آیا اور اونٹوں کے بچوں بچ سے ہوتا ہوا عتیہ پر جا پڑا اور اس کو پھاڑ کھایا۔

پھوپھی حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب، حضرت اُمّ عطیہؓ، لیلیٰؓ بنت قائف اور حضرت اسماءؓ بنت عمیس نے حضورؐ کی ہدایت کے مطابق غسل دیا۔ حضورؐ نے کفن کے لیے اپنی چادر مبارک دی اور خود ہی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت ابوطحہؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت اسامہؓ بن زید اور حضرت فضل بن عباسؓ حضورؐ کی اجازت سے قبر میں اترے اور سیدہؓ کو جنت البقیع میں سپردِ خاک کر دیا۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جس وقت سیدہؓ کو قبر میں اتارا گیا، حضورؐ قبر کے پاس تشریف فرما تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سیدہ اُمّ کلثومؓ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔





سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ولادت

سے

سن شعور تک



ولادتِ باسعادت

سیدہ فاطمۃ الزہراءؑ کی تاریخِ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے اس سلسلہ کی مشہور روایات یہ ہیں:

(۱) آپ بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل اس زمانے میں پیدا ہوئیں۔ جب قریش خانہ کعبہ کی از سر نو تعمیر میں مشغول تھے۔ اس وقت سرورِ کائنات ﷺ کی عمر مبارک ۳۵ سال کی تھی اور ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی پچاس سال۔

(۲) آپ پہلے سال نبوت کے ماہ جمادی الاخریٰ کی بیس تاریخ کو پیدا ہوئیں۔ (۱۔ بعثت یا ۲۔ ولادتِ نبوی مطابق ۶۱۱ عیسوی)

(۳) آپ بعثت سے تقریباً ایک سال پہلے پیدا ہوئیں۔

(۴) آپ کی ولادت ۵۔ بعثت (نبوت) میں ۲۰ جمادی الاخریٰ کو ہوئی۔

جمہور اربابِ سیر نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے اور درایت کی رو سے بھی یہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اکثر مستند روایتوں میں وفات (۱۱ھ) کے وقت سیدہ کی عمر ۲۸ یا ۲۹ سال بتائی گئی ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سیدہ کی ولادت بعثت سے تقریباً پانچ سال قبل تسلیم کیا جائے۔ ہم نے اس کتاب میں اسی روایت کو اختیار کیا ہے۔

بچپن سے سن شعور تک

بار

کتاب حدیث اور سیر و تاریخ میں سیدۃ النساء کی ابتدائی زندگی کے بہت کم واقعات ملتے ہیں۔ صرف چند روایات ہیں جن سے ان کے بچپن سے سن شعور تک کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ بات صرف سیدۃ النساء کی ذات گرامی تک محدود نہیں بلکہ دوسری بنات طاہرات، ازواج مطہرات اور بیشتر صحابہ کرام و صحابیات کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اہل سیر اور مؤرخین نے زیادہ توجہ خاص ذات رسالت مآب ﷺ کی سیرت مقدسہ بیان کرنے پر دی ہے اور آپ کے متعلقین (اولاد، ازواج اور صحابہ) کے بالعموم وہی حالات بیان کیے ہیں جن کا براہ راست حضور پر نور سے تعلق تھا یا اسلامی سیاست اور ریاست سے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سیرت کی قدیم کتابوں میں سیدۃ النساء کے ذکر سے دانستہ اغماض برتا گیا۔ بہر صورت جو تھوڑی بہت روایات ملتی ہیں ان سے سیدۃ النساء کے بچپن سے جوانی تک کے حالات کا کچھ نہ کچھ علم ضرور ہو جاتا ہے۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ فاطمہؓ فطری طور پر ہی نہایت متین اور تنہائی پسند طبیعت کی مالک تھیں۔ بچپن میں انہوں نے نہ کبھی کھیل کود میں حصہ لیا اور نہ گھر سے باہر قدم نکالا۔ چونکہ والدین کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں اس لیے رسول اکرم ﷺ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کو ان سے غایت درجہ کی محبت تھی۔ ننھی سیدہ بچپن میں اپنے فخر موجودات پدر گرامی ﷺ کے عادات و اطوار، رفتار و گفتار کو غور سے دیکھتی رہتی تھیں اور حضور پر نور کی عادات

مقدسہ کو اپنے آئینہ قلب پر منعکس کرتی رہتی تھیں۔ سید الانام ﷺ جب کبھی باہر تشریف لاتے تو بلند آواز میں ”السلام علیکم“ کہتے اور پھر چند لمحے توقف کر کے گھر کے اندر داخل ہوتے۔ ننھی سیدہ اپنے برگزیدہ اور پیارے باپ کی آواز سن کر گھر کے دروازے تک دوڑی جاتیں اور حضور کی انکسبت مبارک پکڑ کر ساتھ لاتیں۔ سرورِ عالم ﷺ اپنی نشست گاہ میں پہنچ کر سیدہ کو اپنی آغوش مبارک میں لے لیتے اور نہایت شفقت اور محبت کے ساتھ ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے۔

ننھی سیدہ وقتاً فوقتاً رسول اکرم ﷺ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے ایسے ایسے سوالات پوچھتیں جن سے ان کی ذہانت اور فطانت کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک دن ننھی سیدہ نے اپنی والدہ ماجدہ سے پوچھا کہ اماں جان، اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں اور دنیا کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ہمیں نظر بھی آسکتا ہے؟

حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے فرمایا۔ ”بیٹی اگر ہم دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اس کے بندوں کے ساتھ ہمدردی اور نیکی کریں۔ اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہیں، کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں، صرف اسی کو عبادت کے لائق سمجھیں اور اللہ کے رسول پر ایمان لائیں تو قیامت کے دن ہم ضرور اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ اس دن نیکی اور بدی کا حساب بھی ہوگا۔“

رسول اکرم ﷺ گھر تشریف لاتے تو ننھی فاطمہ کو ایسی ایسی باتیں سکھاتے جن سے خدا شناسی اور اللہ کے بندوں سے محبت کا سبق ملتا — مبداء فیض نے انہیں کمال درجے کی ذہانت عطا کی تھی۔ جو بات ایک دفعہ سن لیتیں ہمیشہ یاد رکھتی تھیں۔ جب حضور گھر سے باہر تشریف لے جاتے تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ ننھی سیدہ سے دریافت کرتیں کہ آج اپنے ابا جان سے کون کون سی باتیں سیکھی ہیں، وہ فوراً سب کچھ بتا دیتیں۔

سیدہ فاطمہؓ کو دنیا کی نمود و نمائش سے بچپن ہی میں سخت نفرت تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے کسی عزیز کی شادی تھی انہوں نے اپنی بچیوں کے لیے اس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے اچھے اچھے کپڑے اور زیور بنوائے۔ جب گھر سے چلنے کا وقت آیا تو سیدہ فاطمہؓ نے یہ کپڑے اور زیور پہننے سے صاف انکار کر دیا اور معمولی کپڑوں میں ہی محفل شادی میں شریک ہوئیں۔ گویا بچپن سے ہی ان کے عادات و اطوار سے خدادستی اور استغناء کا اظہار ہوتا تھا۔

بعثت کے بعد سرورِ کونین ﷺ تین سال تک نہایت رازداری کے ساتھ فریضہ تبلیغ ادا فرماتے رہے جب چوتھے سال کے آغاز میں خدائے حکیم و برتر کی طرف سے واضح حکم آیا:

فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝

(احکامِ الہی بر ملا سنائیے اور مشرکوں کی طرف سے منہ پھیر لیجئے یعنی ان کی مخالفت کی پروا نہ کیجئے)

تو حضورؐ نے ہر خاص و عام کو علانیہ حق کی طرف بلانا شروع کر دیا۔ اس پر کفارِ مکہ آپؐ کے درپے آزار ہو گئے اور انہوں نے حضورؐ کو ستانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ وہی قریش جو آپؐ کی عظمتِ کردار کے دل و جان سے معترف تھے اور جن کی زبانیں آپؐ کو صادق اور امین کہتے کہتے نہیں تھکتی تھیں، اب آپؐ کے خون کے پیاسے بن گئے۔ ان لوگوں کے دو گروہ تھے، ایک گروہ اسلام کا دشمن تو ضرور تھا لیکن وہ حضورؐ کو جسمانی ایذا دینے سے اجتناب کرتا تھا۔ اس گروہ میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ابوسفیان جیسے لوگ شامل تھے۔ دوسرے گروہ کو کسی ذلیل سے ذلیل اور کمینہ سے کمینہ حرکت سے بھی اجتناب نہ تھا اس میں ابولہب،

ابو جہل، عقیبہ بن ابی معیط، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، عدی بن حمراء، نضر بن الحارث، ابن الاصداء اور امیہ بن خلف وغیرہ جیسے بدطینت لوگ شامل تھے۔ اہل سیر نے متعدد واقعات بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہاتھ دھو کر حضور کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ۱۰ نبوت میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد تو وہ حضور کو ایذا میں پہنچانے میں بہت جری ہو گئے۔ حضور کے راستے میں کانٹے بچھانا، آپ کے سر اقدس پر خاک اور کیچڑ پھینکنا، آپ کا گلا گھونٹنا، پشت مبارک پر اونٹ کی اوجھ رکھنا، گالیاں دینا، تمسخر اڑانا اور اسی قسم کی چھچھوری اور کمینہ حرکات ان بدبختوں سے اسی زمانے میں سرزد ہوئیں۔ حضور کے ساتھ انہوں نے آپ کی دعوت قبول کرنے والوں کو بھی اپنے جور و تعدی کا نشانہ بنا لیا تھا اور ان پر ایسے ایسے ستم ڈھاتے رہتے تھے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ جاتی تھی۔ سیدہ فاطمہ نے ایسے ہی نامساعد حالات میں پرورش پائی۔ وہ اپنے عظیم باپ اور آپ کے نام لیواؤں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھتیں تو بہت آزرده ہوتیں لیکن کم سنی کے باوجود وہ ان حالات سے کبھی خوفزدہ نہ ہوئیں بلکہ ہر مشکل موقع پر حضور کی نمکساری اور خدمت کی۔ کسی وقت بتھمائے فطری حضور کی مصیبتوں پر اشکبار ہو جاتیں تو حضور انہیں تسلی دیتے اور فرماتے:

”میری بچی گھبراؤ نہیں، خدا تمہارے باپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔“

تبلیغ حق کے دوران میں کفار حضور کے ساتھ کوئی شرارت کرتے اور سیدہ کو خبر پہنچتی تو وہ بے چین ہو جاتیں۔ حضور گھر تشریف لاتے تو دوسری بہنوں کے ساتھ وہ بھی حضور کو تسلی دیتیں، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے رو دھو کر حضور کو تبلیغ حق سے منع کیا ہو۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کعبہ معلیٰ کے نزدیک مصروف نماز تھے قریب ہی کفار قریش نے مجلس لہو گرم کر رکھی تھی ابو جہل کو شرارت جو سو جھی تو اس نے اہل

مجلس سے مخاطب ہو کر کہا— ”ذرا اس شخص (حضور) کی طرف تو دیکھو، کاش اس وقت کوئی شخص فلاں قبیلہ میں جاتا، وہاں اونٹ ذبح ہوا ہے اس کی اوجھ (اوجھڑی) اٹھالاتا اور یہ شخص جب سجدہ میں جاتا تو اس کی پیٹھ (یا گردن) پر رکھ دیتا“۔

عقبہ بن ابی معیط نے کہا ”یہ کام میں کروں گا“ چنانچہ وہ لپک کر گیا اور خون اور گوبر سے بھری ہوئی اونٹ کی اوجھ لا کر ایسی حالت میں حضور کے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھ دی جب کہ آپ سر بسجود تھے۔ کفار کو یہ منظر دیکھ کر اس قدر مسرت ہوئی کہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے کے اوپر گرتے پڑتے تھے۔ اونٹ کی اوجھ بڑی وزنی ہوتی ہے حضور کو اس سے بے حد تکلیف ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اس زمانے میں عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چرایا کرتے تھے، اشرار کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی البتہ دوڑتے ہوئے حضور کے گھر پہنچے اور اس واقعہ کی اطلاع دی— سیدہ فاطمہؓ یہ خبر سن کر بے چین ہو گئیں۔ دوڑتی ہوئی کعبہ پہنچیں اور حضور کی گردن مبارک سے اوجھ ہٹائی۔ کفار ارد گرد کھڑے ہو کر ہنستے اور تالیاں پیٹتے تھے۔ سرور کونین ﷺ کی لخت جگر نے ایک نگاہ خشم آلودان پر ڈالی اور فرمایا—

”شریرو! حکم الحاکمین تمہیں ان شرارتوں کی سزا دے گا“

ایک اور روایت میں ہے کہ سیدہ نے اس موقع پر مشرکین قریش کو بہت بددعا میں دیں اور عقبہ بن ابی معیط کو بھی بہت برا بھلا کہا۔

صحیحین میں ہے کہ اس موقع پر خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اشقیاء قریش کے لیے بددعا کی اور فرمایا— ”الہی کفار کی اس ٹولی کو سزا دے“۔ اس بددعا میں آپ نے ابو جہل، عقبہ بن معیط، امیہ بن خلف، عقبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا خاص طور پر نام لیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ مجھے اس ذاتِ برحق کی قسم جس نے حضور محمد ﷺ کو سچا نبی معبوث فرمایا، میں نے ان اشخاص کو جن کا نام لے کر آپ

نے بددعا کی تھی، بدر کے میدان جنگ میں ذلت کے ساتھ پڑا پایا۔ ان کی لاشیں گھیٹ کر ایک گڑھے (کنوئیں) میں ڈالی گئی تھیں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

امام جلال الدین سیوطی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کی بعثت کے ابتدائی زمانے میں ایک دن ابو جہل نے سیدہ فاطمہؓ کو کسی بات پر تھپڑ مار دیا، کمن سیدہ روتی روتی حضورؐ کے پاس گئیں اور ابو جہل کی شکایت کی۔

آپ نے ان سے فرمایا:

”بیٹی جاؤ اور ابوسفیان کو ابو جہل کی اس حرکت سے آگاہ کرو۔“

وہ ابوسفیان کے پاس گئیں اور انہیں سارا واقعہ سنایا — ابوسفیان نے ننھی فاطمہؓ کی انگلی پکڑی اور سیدھے وہاں پہنچے جہاں ابو جہل بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے سیدہ سے کہا — ”بیٹی جس طرح اس نے تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تھا تم بھی اس کے منہ پر تھپڑ مارو۔ (اگر یہ کچھ بولے گا تو میں اس سے نبٹ لوں گا)“

چنانچہ سیدہ نے ابو جہل کو تھپڑ مارا اور پھر گھر جا کر حضورؐ کو یہ بات بتائی، آپ نے دعا کی:

”الہی ابوسفیان کے اس سلوک کو نہ بھولنا۔“

حضورؐ کی اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ چند سال بعد ابوسفیانؓ نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔

(سیرۃ نبویہ احمد زینی دحلان بر حاشیہ سیرۃ حلبیہ جلد ۲)

شعبِ ابی طالب کی محصوری

۶۔ ہجری میں جب عم رسول حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت عمر بن خطاب نے اسلام قبول کیا تو مشرکین قریش فرطِ غضب سے دیوانے ہو گئے اور ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ تمام اکابر قریش نے جمع ہو کر بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو مطلب محمد ﷺ کو قتل کرنے کے لیے ان کے حوالے نہ کریں گے کوئی شخص ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا، نہ ان کے پاس کوئی چیز فروخت کی جائے گی، نہ ان سے رشتہ ناتا کیا جائے گا اور نہ انہیں کھلے بندوں پھرنے دیا جائے گا۔ اس فیصلہ کو معرضِ تحریر میں لا کر ہر قبیلہ کے نمائندے نے دستخط کیے یا انگوٹھا لگایا اور پھر اسے در کعبہ پر آویزاں کر دیا۔

جب بنو ہاشم کو اس خوفناک معاہدے کا علم ہوا تو وہ مطلق ہراساں نہ ہوئے اور مشرکین کا مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ خاندان کے بزرگ حضرت ابوطالب، ہاشم اور مطلب کی تمام اولاد و احفاد کو ساتھ لے کر شعبِ ابی طالب میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ان پناہ گزینوں میں بوڑھے جوان عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ صرف ابولہب اور اس کے زیر اثر چند ہاشمیوں نے مشرکین کا ساتھ دیا۔

شعبِ ابی طالب سے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ کسی روایت میں اسے دامنِ کوہ کا ایک کشادہ مکان بتایا گیا ہے اور کسی میں اسے پہاڑ کا ایک درہ بتایا گیا ہے جو خاندانِ ہاشم کا موروثی تھا۔

مشرکین مکہ نے یکم محرم کے بعد بعثت کو شعبِ ابی طالب کا محاصرہ کر لیا اور

اس میں اتنی سختی برتی کہ کھانے پینے کی کوئی چیز محصورین کو نہ پہنچنے دیتے تھے۔ باہر سے اگر کوئی سوداگر غلہ فروخت کرنے کے لیے لاتا تو اس سے ایک ایک دانہ خرید کر قابو میں کر لیتے تاکہ اسے محصورین نہ خرید سکیں۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے بچے جب بھوک سے بے تاب ہو کر روتے تھے تو مشرکین ان کی آوازیں سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ عورتوں کی چھاتیوں میں دودھ خشک ہو گیا تھا۔ محصورین کے منہ میں کئی کئی دن تک ایک کھیل بھی اڑ کر نہ جاتی تھی۔ اگر کبھی حضرت ابو بکر صدیق یا دوسرے غیر ہاشمی جاں نثار چوری چھپے جان جو کھوں میں ڈال کر کوئی چیز شعب ابی طالب میں پہنچاتے تو اس کی مقدار اتنی قلیل ہوتی کہ چند دن بھی ساتھ نہ دیتی۔ چنانچہ بے کس محصورین درختوں اور جھاڑیوں کی پتیاں اُبال اُبال کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رات کو انہیں سوکھے ہوئے چمڑے کا ایک ٹکڑا کہیں سے مل گیا۔ انہوں نے اسے پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور کوٹ کر پانی میں گھولا اور ستو کی طرح پیایا۔

(روض الانف سہلی)

غرض بنو ہاشم اور بنو مطلب مسلسل تین برس تک شعب ابی طالب میں زہرہ گداز اور حوصلہ فرسا مصائب و آلام کا شکار رہے۔ سیدہ فاطمہ الزہراء نے بھی مصیبت کا یہ زمانہ اپنے عظیم المرتبت والدین اور دوسرے اعزہ واقارب کے ساتھ محصوری میں گزارا اور تمام سختیاں بڑے صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیں۔ ان تین سالوں کے دوران میں جب حج کا موسم آتا تو رحمت عالم ﷺ مردانہ وار شعب ابی طالب سے نکلتے اور لوگوں کو دعوتِ توحید دیتے۔ بخت ابولہب حضور

سیدنا حضرت سعد بن ابی وقاص اگرچہ نہ ہاشمی تھے اور نہ مُطلس لیکن انہوں نے برضا و رغبت اس مصیبت میں رسول اکرم ﷺ کا ساتھ دیا تھا۔

کے پیچھے پیچھے پھرتا اور لوگوں سے کہتا، ”لوگو! میرا یہ بھتیجا دیوانہ (نعوذ باللہ) ہو گیا ہے۔ اس کی باتوں پر مت دھیان دو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“

محسوری کا خاتمہ

مشرکین میں بعض رحم دل آدمی بھی تھے۔ ان کا دل بنو ہاشم کی مصیبت پر کڑھتا تھا لیکن ان سے علانیہ ہمدردی کا اظہار کر کے عامتہ المشرکین سے عداوت مول لینے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا لیکن ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بھتیجے حکیم بن حزام نے (جو اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے) اپنے غلام کے ہاتھ کچھ گندم اپنی پھوپھی (حضرت خدیجہؓ) کو دینے کے لیے روانہ کی۔ راستے میں اسے ابو جہل مل گیا، — پوچھا ”گندم کہاں لیے جا رہے ہو۔“

اس نے کہا ”شعب ابی طالب میں خدیجہ کے پاس۔“

ابو جہل نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ ”یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، بنو ہاشم کو ہم گندم کا ایک دانہ بھی نہ پہنچنے دیں گے۔“

اتفاق سے ابوالبختری بن ہشام ایک غیر مسلم رحمدل رئیس کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے پوچھا، ”تم آپس میں کیوں جھگڑ رہے ہو؟“ ابو جہل نے واقعہ بتایا اور کہا کہ ”معاہدہ کے مطابق ہم کوئی چیز شعب ابی طالب میں نہیں پہنچا سکتے لیکن یہ شخص ہم سے بالا ہی بالا بنی ہاشم کو غلہ پہنچانا چاہتا ہے۔“

ابوالبختری نے کہا۔ ”خدیجہ نے کچھ گندم اپنے بھتیجے کے پاس امانت رکھی تھی اگر وہ اسے واپس کرنا چاہتا ہے تو ہمارا اس میں کیا حرج ہے؟“

ابو جہل نے کہا۔ ”تم بھی بنو ہاشم کے خیر خواہ معلوم ہوتے ہو، ہوا کرو ہمیں اس کی پروا نہیں لیکن میں یہ گندم شعب ابی طالب میں ہرگز نہ پہنچنے دوں گا۔“

ابوالبختری کو بھی اب جوش آ گیا۔ اس نے کڑک کر کہا۔ ”اچھا تو پھر میں

دیکھو نگا کہ تم یہ گندم کیسے بنی ہاشم کو نہیں پہنچنے دیتے۔“

یہ کہہ کر اس نے ابو جہل کو پکڑ کر زمین پر دے مارا اور خوب پیٹا حتیٰ کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ ابوالبختری کی شہ زوری کے سامنے ابو جہل کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ کان دبا کر بھاگ گیا۔ حکیم بن حزام کے غلام نے اب اطمینان کے ساتھ گندم شعب ابی طالب میں پہنچا دی۔

ابو جہل کی رسوائی کا قصہ جب عام لوگوں میں پھیلا تو طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور کچھ لوگوں نے برملا محصورین سے ہمدردی کا اظہار شروع کر دیا۔ بنی مخزوم کا ایک رحمل شخص ہشام عامری، عبدالمطلب کے نواسے زہیر بن ابوامیہ کے پاس گیا اور کہنے لگا — ”اے زہیر! تم یہ کیسے گوارا کرتے ہو کہ تم تو دونوں وقت شکم سیر ہو کر کھاؤ اور تمہارے ماموں روٹی کے ایک لقمے کو بھی ترسیں۔“

زہیر نے کہا — ”برادرِ عم، میرے بس میں ہوتا تو میں اس ناپاک معاہدے کا قصہ کبھی کا پاک کر چکا ہوتا لیکن افسوس کہ میں اکیلا ہوں۔“

ہشام نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کمر ہمت باندھو ہمیں اور بھی کئی ساتھی مل جائیں گے۔“

اب زہیر اور ہشام دونوں مطعم بن عدی کے ہاں پہنچے وہاں زمعہ بن الاسود اور ابوالبختری کو بھی اپنا ہم خیال پایا۔ دوسرے دن بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سب خیر خواہ کعبہ میں پہنچے، قریش کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا:

”یا معشرِ قریش! کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ہم شکم سیر ہو کر کھاتے ہیں لیکن بنو ہاشم اور بنو مطلب جو ہمارے ہی بھائی بند ہیں، اناج کے ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں۔ ان کے بچے اور عورتیں بھوک سے ہلکان ہو گئے ہیں۔ خدا کی قسم جب تک اس معاہدے کو چاک نہ کیا جائے گا ہم

آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔“

ابو جہل نے فرطِ غضب میں چلا کر کہا۔ ”کسی کی مجال نہیں جو اس معاہدے کو ہاتھ لگائے۔ یہ معاہدہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک بنو ہاشم محمدؐ کو ہمارے حوالے نہ کر دیں۔“

زمعہ لکارا۔ ”تو جھوٹ بکتا ہے ہم تو پہلے دن ہی اس معاہدہ پر راضی نہ تھے۔“

معظم بن عدی اور ابوالبختری نے ہاتھ بڑھا کر دیمک خوردہ معاہدے کو در کعبہ سے اتار لیا اور پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیا۔ مشرکین منہ دیکھتے رہ گئے۔

اس کے بعد زمعہ، ابوالبختری، زہیر، مطعم اور ان کے دوسرے ساتھی مسلح ہو کر شعب ابی طالب پہنچے اور بیکس محصورین کو وہاں سے نکال لائے۔ اس طرح تین برس کی ہولناک قید و محن کے بعد ان مظلوموں کو شہر میں رہنا نصیب ہوا۔ چند دن نہیں، چند ہفتے نہیں، چند مہینے نہیں مسلسل تین برس تک خوفناک مصائب برداشت کرنا اور جبین ہمت پر شکن تک نہ آنے دینا، استقامت اور عزیمت کا ایسا مظاہرہ تھا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔



عام الحزن (غم کا سال)

شعب ابی طالب کی محسوری اور سہ سالہ مقاطعہ کے خاتمے سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اطمینان نصیب ہوا تھا وہ بہت جلد رنج و غم میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا سبب حضورؐ کے زبردست حامی و ناصر اور شفیق چچا ابوطالب اور آپ کی انتہائی وفادار اور غمگسار اہلیہ حضرت خدیجہؓ کی وفات تھی۔ یہ دونوں صدے آپؐ کو ۱۰۔ بعدِ بعثت پیش آئے اس لیے آپؐ اس سال کو ”عام الحزن“ (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

حضورؐ کی ان دونوں غمگسار ہستیوں کے سال وفات کے بارے میں تو تمام اہل سیر متفق ہیں البتہ وفات کے مہینے اور تاریخ کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔

علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ ابوطالب ۱۵ شوال ۱۰۔ ت کو فوت ہوئے اور اس کے ایک مہینہ پانچ دن بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے وفات پائی۔ حافظ ابن عبدالبر نے ”الاستیعاب“ میں لکھا ہے کہ ابوطالب شعب ابی طالب سے نکلنے کے چھ ماہ بعد فوت ہوئے اور ان کے صرف تین دن بعد حضرت خدیجہؓ رحلت گزین عالم جاوداں ہوئیں۔

ابن اثیر کا بیان ہے کہ ابوطالب شوال یا ذی القعدہ ۱۰۔ بعثت میں فوت ہوئے اور ان کی اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی رحلت میں ۳۵ دن کا وقفہ تھا۔

ابن قتیبہ، حافظ ابن عبدالبر کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابوطالب اور حضرت خدیجہ کی وفات میں تین دن کا فصل تھا البتہ ابن جوزی نے اس فصل کی مدت ۵ دن لکھی ہے۔

بعض ارباب سیر نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات ابوطالب سے پہلے ہوئی۔ واقدی کے بیان کے مطابق وہ ابوطالب سے ۳۵ دن پہلے عالم بقا کو سدھاریں۔

قسطلانی اور بلاذری نے حضرت خدیجہ کی وفات رمضان ۱۰ نبوت میں بتائی ہے۔ بلاذری نے تخصیص کے ساتھ تاریخ وفات ۱۰ رمضان لکھی ہے۔ جمہور علماء اسی بات کے قائل ہیں کہ حضرت خدیجہ، ابوطالب کے بعد فوت ہوئیں۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات نے سیدہ فاطمہ کو شفقتِ مادری سے محروم کر دیا اور وہ سخت غم زدہ ہو گئیں تاہم حضور اور دوسری بہنوں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور وہ اللہ کی رضا پر شاکر ہو گئیں۔

جناب ابوطالب اور اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے انتقال کے بعد مشرکین قریش کی مخالف اور ایذا رسانی میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ۱۰ نبوت سے ۱۳ نبوت (ہجرتِ مدینہ) تک کا زمانہ حضور کے لیے اتنا سخت اور پر آشوب تھا کہ اس کی تفصیل پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں کفار کے مظالم کا مقابلہ کرنا، دوسرے مظلوم مسلمانوں کی دلجوئی اور غمگساری کرنا اور دعوتِ حق کو مسلسل جاری رکھنا، یہ سارے کام حضور ﷺ کو تنہا انجام دینے پڑتے تھے۔

بعض اہل سیر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مشرکین کی طرف سے حضور کو جسمانی ایذا میں پہنچانے کے بیشتر واقعات اسی زمانے میں پیش آئے کیونکہ حضرت خدیجہ اور ابوطالب کے اثر و رسوخ اور اعلیٰ حیثیت کے پیش نظر ان کی زندگی میں مشرکین

کو حضورؐ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی لیکن جونہی ان دونوں ہستیوں کی آنکھیں بند ہوئیں مشرکین قریش نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا اور حضورؐ کو ستانے میں شرافت اور انسانیت کی تمام حدود پھلانگ گئے تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ نبوت اور ۱۰ نبوت کے درمیانی عرصے میں بھی بعض موقعوں پر مشرکین نے حضورؐ کو کسی نہ کسی صورت میں ستانے سے گریز نہیں کیا۔ اگر حضورؐ پر بس نہیں چلا تو آپؐ کے نام لیواؤں پر ایسے ایسے ستم توڑے کہ ان کا حال پڑھ کر جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ مشرکین کی ایسی ہی ستم رانیوں سے بچنے کے لیے حضورؐ کی ایک صاحبزادی حضرت رقیہؓ (سیدہ فاطمہؓ کی بڑی بہن) آپؐ کے ایما پر اپنے شوہر حضرت عثمانؓ بن عفان کے ساتھ حبش کو ہجرت کر گئی تھیں (۵ بعد بعثت)۔

ابن اسحاقؒ، ابن جریر طبریؒ اور ابن ہشامؒ نے بیان کیا ہے کہ ایک دن (حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد) ایک بدطینت نے سر بازار حضورؐ کے سر اقدس پر مٹی (یا کچھڑ) ڈال دی۔ آپؐ اسی حالت میں گھر تشریف لائے۔ آپؐ کی ایک صاحبزادی (باختلاف روایت سیدہ ام کلثومؓ یا سیدہ فاطمہؓ) آپؐ کا سر مبارک دھوتی جاتی تھیں اور ساتھ ہی فرط رنج سے روتی جاتی تھیں۔ حضورؐ ان کو تسلی دینے کے لیے یہ فرماتے جاتے تھے: —

”جانِ پدر روؤ نہیں۔ صبر کرو، اللہ تیرے باپ کا حامی ہے اور وہ اسے

قریش کی دراز دستیوں سے مامون کر دے گا۔“

حضور ﷺ کا حضرت سَوَدَةُ سے نکاح

اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ گھر میں سیدہ ام کلثومؓ اور سیدہ فاطمہؓ کی خبر گیری کا کیا انتظام ہو (سیدہ زینبؓ اور سیدہ رقیہؓ کی شادی حضرت خدیجہؓ کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی اور

وہ اپنے گھر بار والی تھیں۔ حضرت عثمان بن مظعون کی اہلیہ حضرت خولہ بنت حکیم السَّلْمِیَّة کو حضور کی پریشانی کا علم ہوا تو انہوں نے تحریک کی کہ حضور حضرت سَوَدَّہ بنت زَمَعہ سے نکاح کر لیں جو ایک سن رسیدہ قدیم الاسلام خاتون تھیں اور اپنے شوہر حضرت سکران بن عمرو کی وفات کے بعد بیوگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔ حضور نے حضرت خولہ کی تجویز سے اتفاق فرمایا اور حضرت سَوَدَّہ بھی حضور سے نکاح پر رضامند ہو گئیں۔ چنانچہ حضرت خدیجہ کی وفات کے چند دن بعد حضرت سَوَدَّہ کے والد زَمَعہ بن قیس نے حضور کو اپنے گھر بلا کر اپنی صاحبزادی کا نکاح آپ سے کر دیا۔ اکثر و بیشتر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی خاتون جن سے حضور نے حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد نکاح کیا حضرت سَوَدَّہ بنت زَمَعہ تھیں۔ لیکن بعض روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سَوَدَّہ سے پہلے حضور کا نکاح حضرت عائشہ صدیقہ سے ہو گیا تھا۔ حقیقت واقعہ کچھ بھی ہو اس بات پر سب اہل سیر کا اتفاق ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد جو خاتون سب سے پہلے اُمّ المؤمنین کی حیثیت سے حضور کے خانہ اقدس میں داخل ہوئیں وہ حضرت سَوَدَّہ بنت زَمَعہ تھیں کیونکہ حضرت عائشہ کی رخصتی ہجرت کے بعد ہوئی۔

حضرت سَوَدَّہ نہایت اعلیٰ اور ارفع کردار کی حامل تھیں۔ ان سے نکاح کے بعد حضور کو اپنے خانگی معاملات کی طرف سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔^۱

۱ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور کے ایماء پر حضرت سَوَدَّہ نے حضرت حاطب بن عمرو کو اپنی طرف سے مقرر کر دیا کہ وہ ان کا نکاح حضور سے کر دیں۔ چنانچہ حضرت حاطب نے ان کا نکاح حضور سے کر دیا۔

۲ اُمّ المؤمنین حضرت سَوَدَّہ بنت زَمَعہ بن قیس بن عبد شمس بن عبد ود عامری کا تعلق قبیلہ عامری بن لؤی سے تھا۔ والدہ کا نام شمس بنت قیس تھا جو انصار کے خاندان بنو نجار سے تھیں۔ ان کا پہلا نکاح اپنے چچا زاد بھائی سکران بن عمرو سے ہوا۔ دونوں میاں بیوی دعوت حق کے آغاز میں ہی مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ حبشہ کی دوسری ہجرت میں دونوں نے حبشہ کی ہجرت اختیار کی وہاں سے چند برس کے بعد مکہ لوٹے تو حضرت سکران نے وطن پہنچ کر سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد حضرت سَوَدَّہ کو اُمّ المؤمنین بننے کا شرف

حاصل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سکرانؓ کی زندگی میں ایک مرتبہ حضرت سوڈہؓ نے خواب میں دیکھا کہ نکیہ کے سہارے لیٹی ہیں کہ آسمان پھٹا اور چاند ان پر گر پڑا۔ انہوں نے یہ خواب حضرت سکرانؓ سے بیان کیا تو انہوں نے کہا، اس کی تعبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ میں عنقریب فوت ہو جاؤں گا، اور تم عرب کے چاند محمد ﷺ کے نکاح میں آؤ گی۔ یہ خواب کچھ عرصہ بعد حرف بہ حرف پورا ہو گیا۔

حضرت سوڈہؓ نہایت رحمدل اور کشادہ دست تھیں جو کچھ ہاتھ آتا نہایت دریا دلی سے حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے سوائے سوڈہؓ کے کسی عورت کو جذبہ رقاہت سے خالی نہ دیکھا۔

حضورؐ کی رحلت کے بعد حضرت سوڈہؓ ساری عمر گھر سے باہر نہ نکلیں۔ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ۲۲ ہجری میں وفات پائی۔ حضورؐ سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی البتہ حضرت سکرانؓ کی صلب سے ایک فرزند عبدالرحمنؓ تھے۔ انہوں نے جب جلولا میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔



رحمتِ عالم ﷺ کا سفرِ طائف

شفیق چچا اور نمگسار بیوی کی یکے بعد دیگرے رحلت نے اگرچہ سرورِ عالم ﷺ کو سخت ملول و محزون کر دیا اور مشرکینِ قریش بھی اپنی چیرہ دستیوں میں آپؐ پر بہت دلیر ہو گئے لیکن آپؐ راہِ حق میں اپنی تبلیغی مساعی کو کسی صورت میں ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ مکہ معظمہ سے جنوب مشرق میں تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر طائف ایک شاداب مقام ہے اور اپنی زرخیزی، باغات کی کثرت اور سرسبز چراگاہوں کی وجہ سے ”عرب کی ملکہ“ کہلاتا ہے۔ جب آفتابِ اسلام فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا، اس وقت طائف پر بنو ثقیف کے اثر و اقتدار کا علم لہرا رہا تھا۔ ان میں عمرو بن عمیر بن عوف ثقفی کا خاندان طائف کا حکمران تھا۔ عمرو کے تین بیٹوں عبدیلیل، مسعود اور حبیب نے طائف میں اپنی ریاست و امارت کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ انکور کے سرسبز باغات اور زرخیز زمینوں کی بے حساب آمدنی نے ان کا دماغ آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ نشہٴ پندار میں وہ اس قدر بدمست تھے کہ کسی دوسرے کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے۔ حضورؐ نے مشرکینِ مکہ کی شدید مخالفت اور شرانگیزیوں کو دیکھ کر سوچا کہ اگر طائف کے طاقتور اور متمول لوگ دعوتِ توحید کو قبول کر لیں تو اسلام کو زبردست تقویت حاصل ہو جائے گی اور ان لوگوں کی اعانت و حمایت سے دعوتِ حق کو نہایت تیزی سے پھیلایا جاسکے گا۔ چنانچہ ایک دن حضورؐ مکہ سے طائف کے لیے پاپیادہ روانہ ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت زید بن حارثہ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ راستے میں آپؐ نے قبیلہ بنو بکر اور

بنو قحطان کو پیغامِ حق سنایا لیکن انہوں نے اس کے جواب میں انتہائی سرد مہری اختیار کی۔ حضورؐ اب طائف پہنچے اور تینوں ثقفی رؤساء کو دعوتِ توحید دی، وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے برہم ہو گئے۔ ان میں سے ایک (بقول بعض عبد یلیل) طنز آمیز لہجے میں بولا:

”خدا نے تمہیں رسول بنا کر اپنے ہاتھ سے کعبہ کا غلاف پرزے پرزے کر دیا ہے یا بروایتِ دیگر تجھے پیغمبر بنا کر خدا نے گویا خود اپنے گھر کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ میں تو کعبہ کے سامنے اپنی داڑھی منڈوا ڈالوں گا اگر خدا نے تجھے اپنا پیغمبر بنایا ہو۔“

ایک تیسری روایت میں اس کے یہ الفاظ بھی منسوب ہیں کہ ”میں کعبے کے پردے کوچ ڈالوں گا اگر اللہ نے تجھے رسالت سونپی ہے۔“

دوسرا (بقول بعض مسعود) تمسخر آمیز لہجے میں یوں گویا ہوا:

”کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہ ملا کہ اس کو رسول بناتا۔ تیرے پاس تو چڑھنے کے لیے سواری تک نہیں۔“

تیسرا (بقول بعض حبیب) منطقیانہ انداز میں کہنے لگا:

”میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا۔ اگر تم واقعی خدا کے سچے رسول ہو تو تمہاری بات جھٹلانا سخت خطرناک ہے اور خلافِ ادب بھی اور اگر تم جھوٹے ہو تو میرے شایانِ شان نہیں کہ ایک کذاب سے گفتگو کروں۔“

حضورؐ ان کے مایوس کن جوابات سن کر وہاں سے رخصت ہوئے تاہم چلنے سے پہلے آپؐ نے ان سے فرمایا— ”جو تم نے کہا میں نے سن لیا مگر اس گفتگو کا چرچا نہ کیا جائے تو مناسب ہے۔“

مگر ان لوگوں نے خاموش رہنے کے بجائے شہر کے اوباشوں، لچوں لفتگوں

اور اپنے غلاموں کہ ہشکار دیا کہ وہ حق کے مقدّس داعیِ اعظمؑ کو خوب ستائیں یہاں تک کہ وہ تنگ آ کر راہِ فرار اختیار کرے۔

ان شریروں کو تفتنِ طبع کا ایک سامان ہاتھ آ گیا۔ حضورؐ انہیں حق کی دعوت دیتے اور وہ آپؐ کو فحش گالیاں دیتے، آوازے کتے اور پتھر مارتے تھے۔ بہ اختلافِ روایت حضورؐ دس دن یا ایک ماہ تک طائف میں مقیم رہے۔ ہر روز یہی تماشا ہوتا تھا۔ محسنِ انسانیتؐ جدھر کا رخ کرتے اشرار آپؐ کا تعاقب کرتے۔ انہوں نے شرارت، خباثت اور غنڈہ پن کی انتہا کر دی۔ بد بختوں نے عربوں کی روایتی مہمان نوازی کو بھی یکسر فراموش کر ڈالا۔ ایسی دریدہ دہنی اور کمینہ پن سے کام لیا کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ جاں نثارِ رسول حضرت زیدؓ بن حارثہ حضورؐ کے دائیں بائیں آگے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے اور بدمعاشوں کے پتھروں کو اپنے ہاتھوں اور جسم پر روکتے تھے لیکن جب چاروں طرف سے پتھر برس رہے ہوں تو کہاں تک حضورؐ کو پتھروں سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ وہ خود بھی زخمی ہو جاتے تھے اور حضورؐ کا جسمِ اطہر بھی لہولہان ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے ٹخنوں، پنڈلیوں اور گھٹنوں سے خون کے دھارے بہہ نکلتے تھے۔ ایک دن شریروں نے اتنے پتھر برسائے کہ حضرت زیدؓ بھی زخموں سے چور چور ہو گئے اور حضورؐ بھی مجروح و نزار ہو کر زمین پر گر پڑے۔ جسمِ اقدس کے ہر حصے سے خون کے فوارے اُبل رہے تھے۔ شریروں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑا کر دیا اور پھر پتھر برسائے شروع کر دیے۔ آخر حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثار ساتھی کے ہمراہ زخموں سے چور چور اور خون میں غلطیدہ طائف سے نکلے اوباشوں نے دور تک تعاقب جاری رکھا۔ طائف کے باہر انگوروں کا ایک باغ تھا جس کے مالک مکہ کے دو قرشی رئیس عتبہ اور شیبہ فرزند ان ربيعہ تھے۔ حضورؐ اس باغ کے احاطہ میں داخل ہو گئے اور انگوروں کی بیلوں کی آڑ میں پناہ لی۔ شریاب تھک کر واپس چلے گئے۔ عتبہ اور شیبہ نے دور

سے ان زخمی اور خستہ حال مسافروں کو دیکھا تو انہوں نے اپنے غلام عدّاس کو حکم دیا کہ جاؤ انگوروں کا ایک خوشہ ان مسافروں کو دے آؤ، انہوں نے ہمارے باغ میں پناہ لی ہے۔ عدّاس نے جلدی جلدی کچھ پکے ہوئے انگور چُنے اور طباق میں رکھ کر مقدّس مسافروں کی طرف چلا۔ اس وقت حضور فرطِ نقاہت سے لیٹے ہوئے تھے، حضرت زیدؓ اپنی چادر سے محبوبِ خدا کے جسمِ مبارک سے خون صاف کر رہے تھے۔ نعلین مبارک میں اتنا خون جم گیا تھا کہ حضور بصدِ مشکل اپنے پاؤں ان سے باہر نکال سکے۔ قریب ہی پانی موجود تھا حضور کڑکھڑاتے ہوئے اٹھے۔ وضو کیا اور بارگاہِ رَبِّ العزت میں یہ دعا مانگی:

”الہی میں اپنے ضعف اور بے بسی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی تحقیر اور بے سروسامانی کی فریاد تیرے ہی حضور پیش کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین اے در ماندہ ناتوانوں کے مالک تو ہی میرا رَبّ ہے۔ اے میرے آقا تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ کسی بیگانے کے پاس جو ترش رو ہو گا یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے مجھ پر قابو پالینے کی طاقت دے دی ہے۔ لیکن جب تو مجھ سے ناخوش نہیں ہے تو مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے۔ کیونکہ تیری عافیت اور بخشش میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذاتِ پاک کے نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے آسمان روشن ہوئے اور جس سے تاریکیاں دور ہوئیں اور دنیا و آخرت کے کام ٹھیک ہوئے۔ تجھ سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر غضب نازل کرے یا تیری ناخوشی مجھ پر وارد ہو۔ عتاب کرنے کا تجھی کو حق ہے۔ میں تیری مرضی پر راضی ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور تیری مدد اور تائید کے بغیر کسی کو کوئی قدرت نہیں۔“

اتنے میں عدّاس نے انگوروں کا طباق آپ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ

انہیں کھالیں۔ حضورؐ نے بِسْمِ اللّٰهِ (یا بروایت دیگر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) کہہ کر انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عَدّاس نے حیران ہو کر کہا ”خدا کی قسم اس سرزمین کے باشندوں سے تو میں نے کبھی ایسی بات نہیں سنی۔“

حضورؐ نے پوچھا ”تم کہاں کے رہنے والے ہو اور کس دین کے پیرو ہو؟“
عَدّاس نے جواب دیا، ”میں ارضِ نبویٰ کا رہنے والا ہوں اور دینِ مسیحی کا پیرو ہوں۔“

آپؐ نے فرمایا ”اچھا تو تم مردِ صالح یونس بن مثنیٰ کے ہم وطن ہو۔“
عَدّاس نے پوچھا: ”آپ یونس بن مثنیٰ کو کیسے جانتے ہیں؟“
فرمایا، ”وہ میرے بھائی ہیں وہ بھی خدا کے نبی تھے اور میں بھی خدا کا نبی ہوں۔“

عَدّاس میں اب تابِ ضبط نہ رہی فوراً رحمتِ عالم ﷺ کے قدموں پر گر پڑا اور پھر والہانہ آپؐ کے سرِ اقدس اور ہاتھوں کو چومتے ہوئے پکاراٹھا:
”میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔“

عتبہ اور شیبہ دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے جب عَدّاس ان کے پاس لوٹ کر گیا تو انہوں نے کہا ”یہ تجھے کیا ہو گیا کہ تو اس مسافر کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔“

عَدّاس نے جواب دیا ”صاحبو آج روئے زمین پر اس مسافر سے بڑھ کر عظیم کوئی ہستی نہیں ہے۔ اس نے مجھے ایک ایسی چیز کی خبر دی جو ایک نبی کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔“

دونوں بھائیوں نے عَدّاس کو ڈانٹ پلائی کہ خبردار اپنا دین مت چھوڑنا تیرا دین اس مسافر کے دین سے بہتر ہے۔

یہاں سے مراجعت فرما کر حضورؐ نخلہ پہنچے اور کچھ دن وہاں قیام فرمانے کے بعد مطعم بن عدی کی حمایت حاصل کر کے مکہ تشریف لے گئے۔ طائف سے رخصت ہوتے وقت حضورؐ نے فرمایا:

”میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے بددعا نہیں کرنا چاہتا، مجھے اپنے اللہ کے کرم سے امید ہے کہ وہ انہیں ہدایت دے گا اور ان کی آئندہ نسلیں خدائے واحد کی پرستار ہوں گی۔“

حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ طائف سے واپسی کا دن میری زندگی کا سخت ترین دن تھا، حتیٰ کہ احد کے دن بھی سخت۔ جبریلؑ نے اس دن مجھ سے پوچھا کہ اگر آپ چاہیں تو طائف کو صفحہ ہستی سے نابود کر دوں۔ (مکہ کے دو طرفہ پہاڑوں ابو قیس اور قعیقعان کو اس پر اُلٹ دوں) لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ”مجھے امید ہے اللہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وَحْدَهُ لا شریک کی عبادت کریں گے۔“

بعض روایتوں میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ طائف سے مکہ واپس تشریف لائے تو خستگی اور زخموں کی وجہ سے نڈھال تھے۔ سیدہ فاطمہؓ پدرِ گرامی کا حال دیکھ کر سخت مضطرب ہوئیں اور کئی دن تک بڑی تن دہی کے ساتھ حضورؐ کی خدمت گزاری میں مصروف رہیں۔ سیدہ اُمّ کلثومؓ بھی اس کام میں چھوٹی بہن کی شریک تھیں۔ دونوں بہنوں کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک حضورؐ کے زخم مندمل نہ ہو گئے اور آپؐ کی صحت بحال نہ ہو گئی۔



ہجرت

طائف سے واپسی کے بعد رحمتِ عالم ﷺ نے تبلیغِ حق کا کام بھرپور سرگرمی سے شروع کر دیا۔ اس سال (۱۱ نبوت میں) مدینہ سے جو لوگ حج کے لیے آئے ان میں سے قبیلہ خزرج کے چھ سلیم الطبع آدمی حضورؐ کی دعوت سے متاثر ہو گئے اور مشرف بہ اسلام ہو کر مدینہ واپس گئے۔ دوسرے سال حج کے موقع پر مدینہ کے بارہ آدمیوں نے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ تیسرے سال مدینہ سے ۷۳ مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت نے مکہ پہنچ کر اس عہد کے ساتھ آپؐ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی کہ آپ مدینہ تشریف لائیں تو ہم اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ آپ کی حمایت و حفاظت کریں گے۔ یہ بیعت ”بیعت عقبہ کبیرہ“ کہلاتی ہے۔ اس بیعت (ذی الحجہ ۱۳ بعد بعثت) کے بعد حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ معدودے چند صحابہ کے سوا تمام صحابہ کرامؓ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر گئے۔ کچھ عرصہ بعد خود ذاتِ رسالت مآبؐ بھی ایک رات حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کو اپنے بستر مبارک پر سلا کر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی معیت میں عازمِ مدینہ ہوئے۔ حضورؐ کی ہجرتِ مدینہ تاریخِ اسلام کا ایک مہتمم بالشان واقعہ ہے۔ مختصر یہ کہ مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمانے کے بعد جب حضورؐ نے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کا آغاز فرمایا تو حضرت زید بن حارثہ کو حکم دیا کہ وہ مکے جا کر وہاں سے آپ کے اہل و عیال اور متعلقین کو مدینہ منورہ لے آئیں

(بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے ساتھ اپنے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافعؓ کو بھی اس مقصد کے لیے مکہ بھیجا) حضورؐ نے انہیں ۵ سو درہم اور دو گوتل اونٹ دیئے۔ ان کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی عبداللہ بن اریقظ کو اپنے صاحبزادے عبداللہ کے نام خط دے کر بھیجا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو ساتھ لے کر مدینہ پہنچ جائیں۔

چنانچہ حضرت زیدؓ بن حارثہ، اُمّ المؤمنین حضرت سودہؓ، حضورؐ کی دو صاحبزادیوں حضرت اُمّ کلثومؓ اور حضرت فاطمہ زہراءؓ اپنی بیوی حضرت اُمّ ایمنؓ اور اپنے صاحبزادے حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو مکہ سے مدینہ لے آئے۔ حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ انہی لوگوں کے ساتھ حضرت اُمّ رومانؓ (اہلیہ صدیق اکبرؓ) حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ کو مدینہ لے آئے۔ حضورؐ کے اہل و عیال مسجد نبوی کے ملحقہ حجروں میں فروکش ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اہل و عیال نے بنو حارث بن خزرج کے محلہ میں حضرت حارثہ بن نعمان کے مکان میں قیام کیا۔

شیعہ مورخ محسن امین العاطلی نے ”اعیان الشیعہ“ میں حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی ہجرت کا واقعہ اس طریقے سے بیان کیا ہے کہ حضورؐ کی ہجرت کے بعد دوسرے دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے لوگوں کی امانتیں ان کو واپس کیں اور پھر اپنی والدہ فاطمہ بنت اسد اور خاندان کی دوسری خواتین حضرت فاطمہ زہراءؓ، فاطمہ بنت زبیر بن عبدالمطلب اور فاطمہ بنت حمزہؓ کو ساتھ لے کر اونٹوں پر عازم مدینہ لے گئے۔ اگرچہ کئی ثقہ اہل سیر نے اس سلسلہ میں حضرت ابورافعؓ کا نام لیا ہے لیکن انہوں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ حضرت ابورافعؓ اس وقت مدینہ کیسے پہنچ گئے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت ابورافعؓ بدر کے بعد ہجرت کر کے مدینہ آئے جبکہ حضورؐ کے اہل و عیال بدر سے پہلے مدینہ پہنچے۔ ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضورؐ نے ابورافعؓ کو حضرت عباسؓ کے قبول اسلام کی مسرت میں آزاد کیا۔ مستند روایات کے مطابق حضرت عباسؓ نے غزوہ خیبر کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے علانیہ اسلام قبول کیا اس لیے بعض اہل سیر کا یہ لکھنا کہ حضرت زیدؓ کے ساتھ حضورؐ کے ”آزاد کردہ غلام“ ابورافعؓ بھی مکے گئے، محل نظر ہے۔

ہوئے۔ ہم نام خواتین کو ساتھ لینے کا مطلب یہ تھا کہ بنتِ رسول اللہ ﷺ دشمن کی زد سے بچ جائیں۔ قریش کے کچھ سواروں نے اس قافلے کا تعاقب کیا اور ضحجان کے مقام پر اس کو روک لیا لیکن شیرِ خدا حضرت علیؑ نے ان کو مار بھگایا اور سارا قافلہ خیر و عافیت کے ساتھ حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں قبا پہنچ گیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے بھائی کو خوش آمدید کہا، بیٹی کو گلے لگایا اور سب کو ساتھ لے کر مدینے میں داخل ہوئے۔

اس روایت کے مطابق حضرت فاطمہؑ الزہراءؑ حضورؐ کے خاص مدینہ منورہ میں داخلہ سے پہلے ہی آپؐ کی خدمت میں پہنچ گئی تھیں لیکن جمہورِ اربابِ سیر کا اسی روایت پر اتفاق ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے۔



شادی

ہجرتِ مدینہ کے وقت سیدہ فاطمہ الزہراءؑ سن بلوغت کو پہنچ چکی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کے ورودِ مدینہ کے کچھ عرصہ بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اکرم ﷺ سے حضرت فاطمہؑ سے عقد کرنے کی درخواست کی۔ حضورؐ خاموش رہے یا بعض روایتوں کے مطابق فرمایا — ”ابوبکر حکم الہی کا انتظار کرو“۔ (علامہ بلاذری نے حضورؐ سے یہ الفاظ منسوب کیے ہیں ”اس سلسلہ میں مجھے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا انتظار ہے“) اس کے بعد حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت فاطمہؑ کے لیے پیغام بھیجا۔ حضورؐ نے انہیں بھی یہی جواب دیا۔ چند دن بعد حضورؐ نے سیدہ فاطمہ الزہراءؑ کی نسبت شیر خدا حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے کر دی۔ یہ نسبت کیسے قرار پائی اس کے متعلق تین مشہور روایتیں یہ ہیں۔

پہلی روایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور سعد بن ابی وقاص نے مشورہ کیا کہ فاطمہؑ کے لیے کئی پیغام حضورؐ کو پہنچے ہیں لیکن آپؐ نے کوئی بھی منظور نہیں فرمایا، اب علیؓ باقی ہیں جو رسول اللہ کے جاں نثار اور محبوب بھی ہیں اور عم زاد بھی، معلوم ہوتا ہے فقر و تنگدستی کی وجہ سے وہ فاطمہؑ کے لیے پیغام نہیں دیتے۔ کیوں نہ انہیں پیغام بھیجنے کی ترغیب دی جائے اور ضرورت ہو تو ان کی

۱۔ بعض سیرت نگاروں نے اس روایت پر تنقید کی ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے ”إصابة“ میں ابن سعدؒ کی اکثر روایتیں حضرت فاطمہؑ کے ترجمہ میں روایت کی ہیں لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

مدد بھی کی جائے۔ تینوں حضرات یہ مشورہ کر کے حضرت علیؑ کو ڈھونڈنے نکلے، وہ جنگل میں اپنا اونٹ چرا رہے تھے۔ تینوں بزرگوں نے بڑے خلوص کے ساتھ حضرت علیؑ کو حضرت فاطمہؑ کے لیے پیغام بھیجنے کی ترغیب دی۔ انہیں اپنی بے سرو سامانی کی بناء پر ایسا کرنے میں تامل ہوا مگر ان حضراتؑ کے مجبور کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ دلی خواہش تو ان کی بھی یہی تھی لیکن فطری حیا پیغام بھیجنے میں مانع تھی، اب جرأت کر کے حضورؑ کو پیغام بھیج دیا۔ حضورؑ نے ان کی استدعا فوراً قبول فرمائی۔ پھر حضورؑ نے حضرت فاطمہؑ الزہراءؑ سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے بزبان خاموشی اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔^۱

دوسری روایت میں یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین کی ایک جماعت نے حضرت علیؑ کو کرم اللہ وجہہ کو حضرت فاطمہؑ کے لیے پیغام بھیجنے کی ترغیب دی۔^۲ حضرت علیؑ حضورؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حرفِ مدعا زبان پر لائے۔ حضورؑ نے فوراً فرمایا اھلاً و مرحباً اور پھر خاموش ہو گئے۔ صحابہؓ کی جماعت باہر منتظر تھی۔ حضرت علیؑ نے انہیں حضورؑ کا جواب سنایا۔ انہوں نے حضرت علیؑ کو مبارکباد دی کہ حضورؑ نے آپ کا پیغام منظور فرمایا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی ایک آزاد کردہ لونڈی نے ایک دن

ان سے پوچھا:

۱۔ مُسَدِّ احمد بن حنبل میں ہے کہ ”حضورؑ کا یہ معمول تھا کہ آپؑ جب اپنی کسی صاحبزادی کا عقد کرنا چاہتے تو ان کے پاس تشریف لے جاتے اور بلند آواز سے فرماتے ”فلاں شخص نے تمہارے لیے نکاح کا پیغام دیا ہے“ اس ارشاد کے جواب میں اگر وہ خاموش رہیں تو آپؑ سمجھ لیتے کہ لڑکی رضامند ہے۔“ حضرت فاطمہؑ کی رضامندی بھی آپؑ نے اسی طرح معلوم کی۔ اسی بناء پر فقہاء نے فرمایا ہے کہ جب ولی بالغ لڑکی کا نکاح کرنا چاہے تو اس سے اجازت لے لے اور حسب ارشاد نبویؐ کنواری لڑکی کا سکوت ہی بمنزلہ رضامندی یا اجازت کے ہوتا ہے۔

۲۔ بعض روایتوں میں صرف انصار کا ذکر ہے اور بعض میں انصار کے ساتھ مہاجرین کا ہونا بھی بیان کیا گیا ہے البتہ بعض اہل سیر نے یہ تخصیص کی ہے کہ یہ مہاجرین بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔

”کیا فاطمہؓ کا پیغام حضورؐ کو کسی نے بھیجا؟“

حضرت علیؓ نے جواب دیا ”مجھے معلوم نہیں۔“

اس نے کہا: ”آپ کیوں پیغام نہیں بھیجتے؟“

علی المرتضیٰؓ نے فرمایا ”میرے پاس کیا چیز ہے کہ میں عقد کروں۔“

اس نیک بخت نے حضرت علی مرتضیٰؓ کو حضورؐ کی خدمت میں بھیجا وہ بارگاہِ

نبویؐ میں حاضر ہوئے تو کچھ حضورؐ کی جلالت اور کچھ فطری حیا کہ زبان سے کچھ نہ

کہہ سکے اور سر جھکا کر خاموش بیٹھ رہے۔

حضورؐ نے خود ہی توجہ فرمائی اور پوچھا:

”علی آج خلاف معمول بالکل ہی چپ چاپ ہو، کیا فاطمہ سے نکاح کی

درخواست لے کر آئے ہو؟“

حضرت علیؓ نے عرض کیا ”بے شک یا رسول اللہ“

حضورؐ نے پوچھا: ”تمہارے پاس حق مہر ادا کرنے کے لیے بھی کچھ ہے؟“

حضرت علیؓ نے عرض کیا: ”ایک زرہ اور ایک گھوڑے کے سوا کچھ نہیں۔“

حضورؐ نے فرمایا: ”گھوڑا تو لڑائی کے لیے ضروری ہے، زرہ کو فروخت کر کے

۱۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر حضورؐ نے حضرت علیؓ کی درخواست قبول فرمائی اور اس واقعہ کے چند

دن بعد انہیں بلا کر یہ استفسار فرمایا:

۲۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر حضرت علیؓ نے حضورؐ کے سوال کا جواب نفی میں دیا اس سے ان کا

مطلب یہ تھا کہ ان کے پاس نقد کچھ بھی نہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ”وہ کھلمی زرہ کیا ہوئی جو میں نے تمہیں

فلاں موقع پر دی تھی؟“ (ایک روایت کے مطابق یہ زرہ حضرت علیؓ کو غزوہ بدر میں حاصل ہوئی تھی) حضرت

علیؓ نے عرض کیا ”وہ تو میرے پاس موجود ہے“

حضورؐ نے فرمایا ”اسی کو فروخت کر کے مہر دے دو“۔ طبقات ابن سعد اور تاریخ انبیس میں ہے کہ یہ زرہ

بنو عبد القیس کے ایک بطن کھلمہ بن محارب سے منسوب تھی۔ بڑی عریض اور ثقیل زرہ تھی جس پر تلواریں ٹوٹ

جاتی تھیں۔

اس کی قیمت لے آؤ۔“

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ارشادِ نبویؐ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔
اس کے بعد حضرت علیؑ نے یہ زرہ فروخت کے لیے صحابہؓ کے سامنے پیش کی۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے ۴۸۰ درم پر یہ زرہ خرید لی اور پھر ہدیہٴ حضرت علیؑ کو واپس دے دی۔ حضرت علیؑ یہ رقم لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا تو آپؐ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں دعائے خیر کی۔ اسی اثناء میں حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کی رضا مندی حاصل کر لی تھی۔ حضرت علیؑ نے زرہ کی قیمتِ فروخت حضورؐ کی خدمت میں پیش کی تو آپؐ نے فرمایا: ”دو تہائی خوشبو وغیرہ پر صرف کرو اور ایک تہائی سامانِ شادی اور دیگر اشیائے خانہ داری پر خرچ کرو۔“ پھر حضورؐ نے حضرت انسؓ بن مالک کو حکم دیا کہ جاؤ ابو بکرؓ، عمرؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمنؓ بن عوف اور دیگر مہاجرین و انصار کو مسجدِ نبویؐ میں بلا لاؤ۔ (خود حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ اس سے پہلے حضورؐ پر وحی آنے کی سی کیفیت طاری ہوئی وہ کیفیت دور ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ جبرئیل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام لائے تھے کہ فاطمہؓ کا نکاح علیؑ سے کر دیا جائے۔)

جب بہت سے صحابہ کرامؓ دربارِ رسالت (مسجدِ نبویؐ) میں جمع ہو گئے تو حضورؐ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

”اے گروہِ مہاجرین و انصار مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ فاطمہ بنتِ محمدؐ کا نکاح علی بن ابی طالب سے کر دوں۔ میں تمہارے سامنے اسی حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔“

۱۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اس میں سے کچھ رقم حضرت بلالؓ کو خوشبو وغیرہ لانے کے لیے دی اور باقی رقم حضرت انسؓ کی والدہ حضرت امِ سلیمؓ کے سپرد کر دی کہ وہ سیدہ کی رخصتی کا انتظام کریں۔ (مدارج النبوة) اس سلسلہ کی ایک دوسری روایت میں حضرت امِ سلیمؓ کی جگہ حضرت ام سلمہؓ کا نام آیا ہے۔

اس کے بعد آپ نے یہ خطبہ نکاح پڑھا:

الْحَمْدُ لِلَّهِ الْمَخْمُودِ بِنِعْمَةِ الْمَعْبُودِ بِقُدْرَتِهِ الْبُطَّاعِ بِسُلْطَانِهِ
الْمَرْهُوبِ مِنْ عَذَابِهِ الْمَرْغُوبِ إِلَيْهِ فِيمَا عِنْدَهُ النَّافِذِ أَمْرَهُ
فِي سَائِهِ وَأَرْضِهِ الَّذِي خَلَقَ الْخَلْقَ بِقُدْرَتِهِ وَمَيَّزَهُمْ
بِحِكْمَتِهِ وَأَحْكَمَهُمْ بِعِزَّتِهِ وَأَعَزَّهُمْ بِدِينِهِ وَأَكْرَمَهُمْ بِنَبِيِّهِ
مُحَمَّدٍ ثُمَّ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى جَعَلَ الْبَصَاهِرَةَ نَسَبًا لَا حِقًّا وَأَمْرًا
مُفْتَرَضًا وَشَجَّ بِهَا الْأَرْحَامَ وَالزَّمَمَهَا الْأَنَامَ فَقَالَ عَزَّوَجَلَّ
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا وَكَانَ
رَبُّكَ قَدِيرًا فَأَمْرُ اللَّهِ يَجْرِي إِلَى قَضَائِهِ وَقَضَاءُهُ يَجْرِي إِلَى
قَدْرِهِ وَقَدْرُهُ يَجْرِي إِلَى أَجَلِهِ فَلِكُلِّ قَضَاءٍ وَلِكُلِّ قَدْرٍ أَجَلٌ
وَلِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ يَسُوحُوهُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ
الْكِتَابِ.

مطالب:

”اللہ کا شکر ہے جو اپنی نعمتوں کے باعث ہر تعریف و تحسین کا سزاوار ہے اور اپنی قدرتوں کی وجہ سے عبادت کے لائق ہے اس کا اقتدار ہر جگہ قائم ہے اس کا حکم زمین و آسمان پر نافذ ہے۔ اس نے مخلوق کو اپنی قدرت سے بنایا اپنے احکام کے ذریعے انہیں آپس میں الگ الگ کیا، انہیں اپنے دین کے ذریعے سے عزت بخشی اور اپنے نبی کے ذریعے سے عظمت و سر بلندی سے بہرہ ور کیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے شادی بیاہ کو ایک لازم امر قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے۔ ”وہی ذات پاک ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا اور بعض کو بعض کا بیٹا بیٹی اور داماد بنایا اور تیرا رب ہر چیز پر قادر ہے“۔ اللہ نے ہر کام کو

اپنی قضا و قدر کے تحت کر دیا ہے اور قضا و قدر کا ایک وقت مقرر ہے اور ہر چیز اپنے وقت پر ہی پوری ہوتی ہے اور ہر اجل کے لیے کتاب ہے۔ خطبہ کے بعد حضورؐ نے حضرت علی مرتضیٰؓ سے متہنم ہو کر فرمایا:

”میں نے چار سو مثقال چاندی کے مہر پر فاطمہ کو تیرے نکاح میں دیا۔ کیا تجھے منظور ہے؟“^۱

حضرت علیؓ نے کہا ”بسرو چشم“^۲

پھر حضورؐ نے بدیں الفاظ دعا کی:

”جمع اللہ شملکما واسعد جدکما وبارک علیکما واخرج منکما ذریۃ طیبۃ“

(اللہ تعالیٰ تم دونوں کی پراگندگی کو جمع کرے، تمہاری کوششوں کو سعید بنائے، تم پر برکت کرے اور تم سے پاک اولاد پیدا کرے)

پھر سب نے مل کر دعائے خیر و برکت مانگی اور ایک طبق کھجوریں حاضرین پر لٹا دی گئیں۔ بقول بعض اس موقع پر حاضرین کو شہد کا شربت اور کھجوریں تقسیم کی گئیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر چھوہارے تقسیم فرمائے۔ اسی بناء پر بعض فقہاء نے نکاح کے وقت چھوہارے یا بادام یا شکر کا لٹانا مستحب قرار دیا ہے۔

تاریخ نکاح کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ مبارک نکاح رمضان المبارک یا ذوالقعدہ یا ذوالحجہ یا صفر ۲ ہجری میں اور بعض کے نزدیک رجب ۲ ہجری میں ہوا۔ ایک اور روایت کے مطابق شوال ۳ ہجری

^۱ بعض روایتوں میں مہر کی رقم پانچ سو درہم اور بعض میں ۴۸۰ درہم بھی بیان کی گئی ہے۔

^۲ ایک روایت میں ہے کہ ایجاب و قبول کے بعد حضرت علیؓ سجدہ شکر میں گر گئے اور یہ دعا مانگی کہ ”الہی مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو مجھے عطا فرمائی اور میرے باپ کو بخشی ہے اور میں وہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ الہی میری ذریت کو صالح قرار دے“۔ اس پر حضورؐ نے آمین فرمایا۔

میں نکاح ہوا۔ کچھ مؤرخین کا قول ہے کہ حضرت فاطمہؓ کا نکاح جب اُحد کے بعد اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی کے ساڑھے چار یا ساڑھے پانچ ماہ بعد ہوا۔ ارباب سیر میں سے اکثر کی رائے یہ ہے کہ یہ مبارک تقریب غزوہ بدر کے بعد اور غزوہ اُحد سے پہلے منعقد ہوئی۔

سیدہ کی رخصتی کے بارے میں بھی اہل سیر میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح کے فوراً بعد رخصتی عمل میں آگئی۔ بعض نے لکھا ہے کہ ایک ماہ بعد رخصتی ہوئی اور بعض کا قول ہے کہ حضرت علیؓ نے نکاح کے ساڑھے سات مہینے یا ساڑھے نو مہینے بعد حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کرائی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نکاح غزوہ بدر کے بعد ہوا اور رخصتانہ غزوہ اُحد کے بعد ہوا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

رخصتی کے دوسرے دن حضورؐ نے خواہش ظاہر کی کہ ولیمہ بھی ہونا چاہیے۔ حضرت سعدؓ نے اس مقصد کے لیے فوراً ایک بھیڑ ہدیہ پیش کر دی اور کچھ انصار نے بھی اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ حضرت علیؓ نے مہر میں سے جو رقم بچی رہی تھی اس سے کچھ اشیاء خریدیں۔ دعوتِ ولیمہ میں دسترخوان پر کھجور، پنیر، نان جو اور گوشت تھا۔ حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ یہ اس زمانے کا بہترین ولیمہ تھا۔

جو اصحاب نکاح کے کچھ عرصہ بعد رخصتی کے قائل ہیں انہوں نے اس سلسلے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے سرورِ کائنات کے کاشانہ اقدس سے کچھ فاصلے پر ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ ایک دن حضرت علیؓ کے بھائی عقیلؓ بن ابی طالب ان کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں رسول کریمؐ اپنی لختِ جگر کو اب رخصت کر دیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا، میری بھی یہی خواہش ہے۔ چنانچہ دونوں حضرات حضرت اُمّ ایمنؓ کے پاس تشریف لے گئے جو حضورؐ کی آزاد کردہ کنیز تھیں اور جنہوں نے حضورؐ کے بچپن میں آپؐ کی

خبر گیری اور خدمت کی تھی۔ سرورِ عالم ﷺ ان کی بے حد تعظیم و توقیر فرماتے تھے اور ”میری ماں“ کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ حضرت اُمّ ایمنؓ ان دونوں کو ازواجِ مطہرات کے پاس لے گئیں انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا: ”یا رسول اللہ علیؑ کی خواہش ہے کہ ان کی بیوی کو رخصت کر دیجیے“۔ حضور رسالت مآبؐ راضی ہو گئے۔ چند درم حضرت علیؑ کو دیئے اور فرمایا: ”جاؤ بازار سے چھوہارے اور پنیر خرید لاؤ“۔ حضرت علیؑ نے پانچ درم کا گھی خریدا۔ ایک درم کا پنیر اور چار درم کے چھوہارے اور سب اشیاء لا کر حضورؐ کے سامنے رکھ دیں۔ حضورؐ نے ان چیزوں کو دعوتِ ولیمہ کے لیے رکھ دیا۔ پھر آپؐ نے حضرت فاطمہ الزہراءؑ کو بلایا، اپنے سینہء مبارک پر ان کا سر رکھا، پیشانی پر بوسہ دیا اور ان کا ہاتھ حضرت علیؑ کے ہاتھ میں دے کر فرمایا:

”اے علیؑ پیغمبر کی بیٹی تجھے مبارک ہو“۔

اور — ”اے فاطمہ تیرا شوہر بہت اچھا ہے اب تم دونوں میاں بیوی اپنے گھر جاؤ“۔

پھر دونوں کو میاں بیوی کے فرائض و حقوق بتائے اور خود دروازے تک وداع کرنے آئے۔ دروازے پر حضرت علیؑ مرتضیٰؑ کے دونوں بازو پکڑ کر انہیں دعائے خیر و برکت دی۔ حضرت علیؑ اور سیدۃ النساءؑ دونوں اونٹ پر سوار ہوئے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اس کی نکیل پکڑی۔ حضرت اسماء بنت عمیسؓ اور بعض روایتوں کے مطابق سلمیٰؓ اُمّ رافع یا حضرت ام ایمنؓ سیدہؑ کے ہمراہ گئیں۔

سرکارِ دو عالمؐ نے اپنی لختِ جگر کو جو جہیز دیا مختلف روایتوں کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے:

- ۱- ایک بستر مصری کپڑے کا، جس میں اون بھری ہوئی تھی۔
- ۲- ایک نقشی تخت یا پلنگ۔
- ۳- ایک چمڑے کا تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

- ۴- ایک مشکیزہ۔
 ۵- دو مٹی کے برتن (یا گھڑے) پانی کے لیے۔
 ۶- ایک چکی (ایک روایت میں ۲ چکیاں درج ہیں)
 ۷- ایک پیالہ۔
 ۸- دو چادریں۔
 ۹- دو بازو بند نقرئی۔
 ۱۰- ایک جانماز۔

حضرت فاطمہؑ کی رخصتی کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؑ کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام فرمایا۔ آپؐ نے جو اشیاء اس مقصد کے لیے منگوائی تھیں ان سب کا مالیدہ تیار کرنے کا حکم دیا اور پھر حضرت علیؑ سے فرمایا کہ باہر جا کر جو مسلمان بھی ملے اسے اندر لے آؤ۔ چنانچہ بہت سے مہاجرین و انصار کو اس بابرکت دعوت میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جب مہمانوں نے کھانا کھالیا تو آپؐ نے ایک پیالہ کھانا حضرت علیؑ کو اور ایک سیدہ فاطمہؑ کو ہرا کو مرحمت فرمایا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری سے روایت ہے کہ میں علیؑ و فاطمہؑ کی دعوتِ ولیمہ میں حاضر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس سے بہتر اور عمدہ دعوتِ ولیمہ کسی کی نہیں دیکھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے گوشت اور چھوہارے سے کھانا تیار کرایا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو آپؐ نے مدینہ کے لوگوں کو بلا بھیجا اور اپنے دستِ مبارک سے مہمانوں میں تقسیم فرمایا۔



اس سلسلے کی کچھ اور روایتیں

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ علیؑ اور فاطمہؑ کے عقد کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ہم (امہات المؤمنین) کو حکم دیا کہ فاطمہؑ کے لیے جہیز تیار کریں اور ان کو علیؑ کے پاس پہنچا دیں۔ فاطمہؑ کے لیے ایک علیحدہ حجرہ تجویز کیا گیا۔ پھر میدانِ بطحاء کے کنارے سے نرم مٹی منگوا کر ہم نے اپنے ہاتھوں سے اس حجرے میں بچھائی اور فرش تیار کیا۔ پھر ہم نے خرما کی چھال اپنے ہاتھ سے تو م کر دو تکیے تیار کیے اور حجرہ کے ایک کونے میں کپڑے اور مشک لٹکانے کے لیے ایک لکڑی گاڑ دی۔ پھر فاطمہؑ کو اس حجرے میں پہنچا دیا۔ اس کے بعد دعوتِ ولیمہ پر ہم نے لوگوں کو کھجوریں اور انگور کھلائے پس ہم نے فاطمہؑ کی شادی سے بہتر کوئی شادی نہیں دیکھی۔ (ابن ماجہ)

ایک روایت میں حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ سے یہ بیان منسوب ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادی کو یہ تین چیزیں دیں، سیاہ رنگ کی ایک چادر، ایک مشک اور ایک تکیہ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی۔ (سنن نسائی)

مُسْنَدِ اَحْمَدِ بْنِ حَنْبَلٍ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ فاطمہؑ کے جہیز میں ایک مشک، ایک چکی اور ایک مخطط کملی بھی دی تھی۔

جب حضرت فاطمہؑ الٰہراء رخصت ہو کر اپنے گھر تشریف لے گئیں تو حضورؐ

ان کے پاس تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت مانگی پھر اندر داخل ہوئے۔ ایک برتن میں پانی منگوایا دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علیؑ کے سینہ اور بازوؤں پر پانی چھڑکا پھر سیدہ فاطمہؑ کو اپنے پاس بلایا۔ وہ شرم و حیا سے جھجکتی ہوئی حضورؐ کے سامنے آئیں۔ آپؐ نے ان پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا:

”اے فاطمہ میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان میں بہترین شخص سے کی ہے۔“ (طبقات ابن سعد)

آپؐ نے پانی چھڑکتے ہوئے یہ بھی فرمایا، الہی میں ان دونوں کو اور ان کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتا ہوں۔ (حسن حصین بحوالہ ابن حبان)

اس سلسلہ میں کچھ اور روایتیں بھی ملتی ہیں جن میں واقعات کسی قدر مختلف پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان روایتوں میں سے بھی کچھ بیان کر دی جائیں۔

ایک روایت میں ہے کہ جب سیدہ فاطمہؑ حضورؐ سے رخصت ہو کر شوہر کے گھر جانے لگیں تو آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ میرے منتظر رہنا۔ چنانچہ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ اپنے گھر جا کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے اور حضورؐ کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد سرورِ عالم ﷺ گھر کے دروازے پر تشریف لائے اور اندر آنے کی اجازت طلب فرمائی۔ حضرت اُمّ ایمنؓ دروازہ کھولنے آئیں تو ان کے اور حضور کے مابین یہ گفتگو ہوئی:

رسول اکرم ﷺ: کیا میرا بھائی اس مکان میں ہے؟
حضرت اُمّ ایمنؓ: یا رسول اللہ وہ آپ کے بھائی کیسے ہوئے آپ نے تو اپنی صاحبزادی کا عقد ان سے کیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ: ہاں یہ بات جائز ہے۔ کیا اس جگہ اسماء بنت عمیس بھی

ہیں اور کیا آپ بنتِ رسولؐ کی تعظیم و تکریم کے لیے آئی ہیں۔

حضرت اُمّ ایمنؓ: جی ہاں، اسماء بنتِ عمیس بھی ہیں اور میں اور وہ بنتِ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و تکریم کے لیے آئی ہیں۔

حضورؐ نے حضرت اُمّ ایمنؓ کو دعائے خیر دی، پھر اندر تشریف لے گئے اور پانی طلب فرمایا۔ ایک لکڑی کے پیالے (یا کسی اور برتن) میں پانی پیش کیا گیا، آپؐ نے اس کو جوٹھا کر کے (یا اس میں اپنے دستِ مبارک ڈال کر) اور اس پر جو کچھ اللہ نے چاہا پڑھ کر حضرت علیؓ کو سامنے بلایا اور ان کے دونوں شانوں، بازوؤں اور سینہ پر وہ پانی چھڑک دیا پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا وہ شرماتی ہوئی سامنے آئیں تو ان پر بھی پانی چھڑک کر فرمایا کہ اے فاطمہ میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔ (ابن سعد و طبرانی)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت فاطمہؓ رخصتی کے بعد اپنے گھر پہنچیں تو حضورؐ حضرت علیؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ ایک برتن میں پانی طلب فرمایا اور وضو کیا پھر پانی پر کچھ دعائیں پڑھیں اور وہ پانی سیدہ فاطمہؓ کے سر و سینہ اور حضرت علیؓ کے سر اور بازوؤں پر چھڑکا اور فرمایا:

”الہی یہ دونوں مجھے دنیا میں سب سے عزیز ہیں تو بھی ان کو دوست رکھ اور ان کی نسل میں برکت عطا فرما اور اپنی طرف سے ان کی حفاظت فرما“۔ (کنز العمال و ابن عساکر)

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کے بعد حضورؐ ان کے گھر تشریف لے گئے اور پانی منگوا کر اس سے وضو کیا اور پھر اسے حضرت علیؓ پر ڈال کر یہ دعا کی:

۱۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر قرآن کریم کی آخری تین سورتیں پڑھ کر حضرت علیؓ پر دم کیا۔ ایک اور روایت میں صرف دو سورتوں (سورہ فلق اور سورہ ناس) کے پڑھنے کا ذکر ہے۔

اللَّهُمَّ بَارِكْ فِيهِمَا وَبَارِكْ لَهُمَا فِي بَنَائِهِمَا.

(اے اللہ ان دونوں کے اسبابِ معیشت میں برکت دے اور دونوں کے خاص تعلق کے بارے میں برکت نازل فرما)

بعض روایتوں میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ عشاء کے بعد حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کے گھر تشریف لے گئے اور ایک برتن میں پانی لے کر اس میں اپنا لعابِ دہن ڈالا اور سورۃ فلق اور سورۃ ناس پڑھ کر دعا کی پھر حضرت علیؑ سے فرمایا کہ پانی پی کر وضو کر لو۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؑ کو بھی پانی پی کر وضو کرنے کی ہدایت فرمائی۔ جب دونوں تعمیلِ ارشاد کر چکے تو حضورؐ نے دعا کی:

”الہی یہ دونوں میرے ہیں اور میں ان کا ہوں جس طرح تو نے مجھ کو

پاک کر دیا ہے اسی طرح ان دونوں کو بھی پاک کر دے“

پھر آپؐ نے انہیں آرام کرنے کی اجازت دی اور دوبارہ دعا کی:

”الہی ان میں محبت پیدا کر، انہیں اور ان کی اولاد کو برکت دے، ان کو

اطمینان عطا کر، ان کو خوش نصیب بنا دے، ان پر برکت نازل کر، ان

کی نسل کو ترقی اور پاکیزگی عطا فرما۔“



نیا گھر

سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ میکے سے رخصت ہو کر جس گھر میں گئیں — وہ مسکن نبویؐ سے کسی قدر فاصلے پر تھا۔ حضورؐ کو وہاں آنے جانے میں تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن آپؐ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا:

”بیٹی مجھے اکثر تمہیں دیکھنے کے لیے آنا پڑتا ہے میں چاہتا ہوں، تمہیں اپنے قریب بلا لوں۔“

سیدہ فاطمہؓ نے عرض کیا — ”آپؐ کے قُرب و جوار میں حارثہ بن نعمان کے بہت سے مکانات ہیں، آپ ان سے فرمائیے وہ کوئی نہ کوئی مکان خالی کر دیں گے۔“

حضرت حارثہ بن نعمان ایک متمول انصاری تھے اور کئی مکانات کے مالک تھے۔ جب سے حضورؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تھے وہ اپنے کئی مکانات حضورؐ کی نذر کر چکے تھے۔ رحمتِ عالم ﷺ نے یہ مکانات مستحق مہاجرین میں تقسیم فرمادیئے تھے۔ جب سیدہ فاطمہؓ نے حارثہ کے مکان کے لیے حضورؐ سے التماس کی تو آپؐ نے فرمایا:

”جان پدر! حارثہ سے اب کوئی اور مکان مانگتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ وہ پہلے ہی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی خوشنودی کے لیے کئی مکانات دے چکے ہیں۔“

حضور کا ارشاد سن کر حضرت فاطمہؓ خاموش ہو گئیں — ہوتے ہوتے یہ خبر حضرت حارثہ بن نعمان تک پہنچی کہ رسول اکرم ﷺ سیدہ فاطمہؓ کو اپنے قریب بلانا چاہتے ہیں لیکن مکان نہیں مل رہا، وہ نہایت مخلص اور ایثار پیشہ آدمی تھے، یہ خبر سنتے ہی بے تاب ہو گئے اور دوڑتے ہوئے رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

”یا رسول اللہ میں نے سنا ہے کہ آپؐ سیدہ فاطمہؓ کو کسی قریب کے مکان میں لانا چاہتے ہیں میں یہ مکان جو آپؐ کے کاشانہء اقدس کے متصل ہے، خالی کیے دیتا ہوں آپؐ کو اس میں بلا لیجیے۔ اے میرے آقا میرا جان و مال آپؐ پر قربان ہے۔ خدا کی قسم جو چیز حضورؐ مجھ سے لیں گے، مجھے اس کا آپؐ کے پاس رہنا زیادہ محبوب ہوگا بہ نسبت اس کے کہ میرے پاس رہے۔“

سرورِ عالم ﷺ نے حضرت حارثہؓ کے جذبہء ایثار کی تحسین فرمائی اور ان کے لیے خیر و برکت کی دعا کی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت حارثہؓ کی پیشکش کے جواب میں فرمایا ”تم سچ کہتے ہو، اللہ تعالیٰ تمہیں خیر و برکت دے۔“

اس کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کو حضرت حارثہؓ بن نعمان والے قریبی مکان میں منتقل کرالیا۔



ازدواجی زندگی

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور سیدہ فاطمہؓ کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ حضرت علیؓ سیدہ کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ سیدہ بھی اپنے شوہر نامدار کا دل و جان سے احترام کرتی تھیں اور ان کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں۔ سرورِ عالم ﷺ اپنی لختِ جگر کو ہمیشہ نصیحت فرماتے رہتے تھے کہ عورت کا سب سے بڑا فرض خاوند کی اطاعت و فرماں برداری ہے۔ اس لیے وہ علیؓ کی ہر طرح اطاعت کریں۔ دوسری طرف حضورؐ حضرت علیؓ کو بھی تاکید فرماتے رہتے تھے کہ فاطمہؓ سے اچھا برتاؤ کرو۔ چنانچہ میاں بیوی کے مثالی تعلقات کی وجہ سے ان کا گھر جنت کا نمونہ بن گیا تھا۔ تاہم دو چار موقعے ایسے ضرور پیش آئے جن میں میاں بیوی میں معمولی رنجش پیدا ہوگئی، انسانی فطرت اور زمانے کے اقتضا کے پیش نظر میاں بیوی کے تعلقاتِ معاشرت میں ایسے اتفاقات کا پیش آجانا کوئی انہونی بات نہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی رنجش بھی محض اتفاقی تھی اور جو نہی حضورؐ پر نورؐ نے مداخلت فرمائی ان کے دلوں میں ملال کا شائبہ تک نہ رہا۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ اور حضرت سیدہؓ کے درمیان کسی بات پر کچھ رنجش ہوگئی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ بیٹی کے گھر تشریف لے گئے! اس وقت روئے انورؐ پر حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ آپؐ نے دونوں کو سمجھا بچھا کر صفائی

کرادی۔ جب باہر تشریف لائے تو بہت بشاش تھے اور چہرہ مبارک فرط مسرت اور اطمینان سے چمک رہا تھا۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا — ”یا رسول اللہ آپ گھر کے اندر گئے تو چہرہ مبارک متغیر تھا اور باہر تشریف لائے ہیں تو بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہے ہیں یہ کیا بات ہے؟“

حضورؐ نے فرمایا: ”میں نے ان دو شخصوں میں صلح صفائی کرادی جو مجھے بہت زیادہ عزیز ہیں“۔ (مدارج النبوة)

اسی طرح ایک بار اور میاں بیوی میں کچھ شکر رنجی ہو گئی۔ سیدہ فاطمہؓ ناراض ہو کر رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں شکایت لے کر گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی آگئے۔ حضرت سیدہؓ نے شکایت پیش کی تو حضورؐ نے فرمایا — ”بیٹی ذرا خیال کرو ایسا کون سا شوہر ہے جو اپنی بیوی کے پاس اس طرح خاموش چلا آتا ہے۔“

ایک دوسری روایت کے مطابق حضورؐ نے اس موقع پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے — ”بیٹی میری بات غور سے سنو، کوئی میاں بیوی ایسے نہیں ہیں جن کے درمیان کبھی اختلاف رائے پیدا نہ ہو اور کون مرد ایسا ہے جو ہر کام بیوی کے مزاج کے مطابق ہی کرتا ہے اور اپنی بیوی کی کسی بات پر ناخوشی کا اظہار نہیں کرتا۔“

رحمت عالم ﷺ کا ارشاد گرامی سن کر سیدنا علیؓ پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے سیدہ فاطمہؓ سے فرمایا:

”خدا کی قسم آئندہ میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو یا جس سے تمہاری دل شکنی ہو۔“ (طبقات ابن سعد و اصابہ لابن حجر)

”مدارج النبوة“ میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے درمیان گھریلو کاموں کی تقسیم فرمادی تھی۔ چنانچہ

گھر کے اندر جتنے کام تھے مثلاً چکی پیسنا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا وغیرہ وہ سب سیدہ فاطمہؓ کے ذمہ تھے اور باہر کے سب کام مثلاً بازار سے سودا سلف لانا، اونٹ کو پانی پلانا وغیرہ حضرت علیؓ کے ذمہ تھے اس طرح ان کی ازدواجی زندگی میں نہایت خوشگوار توازن پیدا ہو گیا تھا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ ابو جہل کے بھائی نے حضرت علیؓ کو غوراء بنت ابی جہل سے نکاح کرنے کی ترغیب دی اور انہوں نے اس کی حامی بھری۔ چنانچہ غوراء کے سرپرست حضورؐ سے اس نکاح کی اجازت لینے آئے۔ حضورؐ کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔^۱ آپؐ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا:

”بنی ہشام بن مغیرہ، علی بن ابی طالب سے اپنی بیٹی کا عقد کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے اجازت مانگتے ہیں لیکن میں اجازت نہ دوں گا، کبھی نہ دوں گا، البتہ علی میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح کر سکتے ہیں۔ فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔“

اس کے بعد اپنی دوسری بیٹی حضرت زینبؓ کے شوہر حضرت ابوالعاصؓ بن ربیع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

”اس نے مجھ سے جو بات کہی اس کو سچ کر کے دکھلا دیا اور جو وعدہ کیا وفا کیا اور میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے نہیں کھڑا ہوا لیکن خدا کی قسم اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی دونوں ایک

۱۔ بعض روایتوں میں ہے کہ سیدۃ النساءؓ نے یہ خبر سنی تو وہ سخت آزرده ہوئیں۔ جب رسول کریمؐ ان کے پاس تشریف لائے تو سیدہؓ نے عرض کی:

”ابا جان علی مجھ پر سوت (سوکن) لانا چاہتے ہیں۔“

یہ سن کر حضورؐ کو سخت ملال ہوا۔

جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔“

حضورؐ کو اس طرح ناراض دیکھ کر حضرت علیؑ نے بنتِ ابوجہل سے نکاح کا ارادہ فوراً ترک کر دیا اور پھر حضرت فاطمہ الزہراءؑ کی زندگی میں کسی دوسرے نکاح کا خیال تک دل میں نہ لائے۔

صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے اور علیؑ کو نہ پایا۔ (حضرت فاطمہ سے) پوچھا، تمہارے ابنِ عم کہاں ہیں؟ بولیں، مجھ میں اور ان میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا وہ غصہ میں چلے گئے ہیں اور یہاں (دوپہر کو) نہیں لیٹے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا، دیکھو وہ کہاں ہیں۔ اس نے آ کر خبر دی کہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے۔ وہ (حضرت علیؑ) لیٹے ہوئے تھے۔ پہلو سے چادر ہٹ گئی تھی اور مٹی جسم میں لگ گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ مٹی پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ اٹھو ابوتراب، اٹھو ابوتراب۔“

حضورؐ حضرت علیؑ کو اپنے ساتھ گھر لائے اور دونوں میاں بیوی میں صلح کرادی۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ کو ابوتراب کہلایا جانا عمر بھر بہت محبوب رہا۔

متذکرہ بالا تین چار اتفاقی واقعات کے سوا حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کی ازدواجی زندگی ہمیشہ نہایت خوشگوار رہی اور ان کا گھر پاکیزگی، اطمینان، سادگی، قناعت اور سعادت کا گہوارہ بنا رہا۔

ایک بار سیدہ فاطمہؑ کو بخار آ گیا۔ رات انہوں نے سخت بے چینی میں کاٹی۔ حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ جاگتا رہا۔ پچھلے پہر ہم دونوں کی

آنکھ لگ گئی۔ فجر کی اذان سن کر بیدار ہوا تو دیکھا کہ فاطمہؓ وضو کر رہی ہیں۔ میں نے مسجد میں جا کر نماز پڑھی واپس آیا تو دیکھا کہ فاطمہ معمول کے مطابق چکی پیس رہی ہیں۔ میں نے کہا، فاطمہ تمہیں اپنے حال پر رحم نہیں آتا۔ رات بھر تمہیں بخار رہا۔ صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کر لیا، اب چکی پیس رہی ہو۔ خدا نہ کرے زیادہ بیمار ہو جاؤ۔

حضرت فاطمہؓ نے سر جھکا کر جواب دیا کہ اگر میں اپنے فرائض ادا کرتے کرتے مر بھی جاؤں تو کچھ پروا نہیں ہے۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھی، اللہ کی اطاعت کے لیے اور چکی پیسی تمہاری اطاعت اور بچوں کی خدمت کے لیے۔

سیدنا حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ ہماری مادرِ گرامی کی زندگی میں باہر کے تمام کام ہمارے والدِ بزرگوار انجام دیتے تھے اور گھر کے اندر تمام کام کاج، کھانا پکانا، چکی پیسنا، جھاڑو دینا وغیرہ سب ہماری مادرِ گرامی خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھیں۔

حضرت فاطمہؓ خانہ داری کے کاموں کی انجام دہی کے لیے کبھی اپنی کسی رشتہ دار یا ہمسایہ کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلاتی تھیں۔ نہ کام کی کثرت اور نہ کسی قسم کی محنت مشقت سے گھراتی تھیں۔ ساری عمر شوہر کے سامنے حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں اور نہ ان سے کسی چیز کی فرمائش کی۔

کھانے کا یہ اصول تھا کہ چاہے خود فاقے سے ہوں جب تک شوہر اور بچوں کو نہ کھلا لیتیں خود ایک لقمہ بھی منہ میں نہ ڈالتیں۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ سر پر گھاس کا ایک گٹھا اٹھائے گھر تشریف لائے اور حضرت فاطمہؓ سے کہا، ذرا یہ گٹھا اتارنے میں میری مدد کرو۔ اس وقت وہ کسی کام میں مصروف تھیں جلد نہ اٹھ سکیں۔ حضرت علیؓ نے گٹھا زمین پر دے مارا اور کہا: —
”معلوم ہوتا ہے تم گھاس کے گٹھے کو ہاتھ لگانے میں سبکی محسوس کرتی ہو۔“

حضرت فاطمہؑ نے معذرت کرتے ہوئے کہا، ہرگز نہیں میں کام میں مصروفیت کی وجہ سے جلد نہ اٹھ سکی ورنہ جو کام میرے ابا جان رسول خدا ہوتے ہوئے اپنے دست مبارک سے کرتے ہیں میں انہیں کرنے میں سبکی کیسے محسوس کر سکتی ہوں۔

حضرت علیؑ ان کا جواب سن کر متبسم ہو گئے اور کوٹھڑی کے اندر چلے گئے۔
حضرت فاطمہؑ کے یہی اوصاف و خصائل تھے کہ ان کی وفات کے بعد جب کسی نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ فاطمہؑ کا حسن معاشرت کیسا تھا تو وہ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:

”فاطمہ جنت کا ایک خوشبودار پھول تھی جس کے مرجھانے کے باوجود اس کی خوشبو سے اب تک میرا دماغ معطر ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں مجھے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔“



شمائل و خصائل

سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ کی صورت اور گفتار و رفتار سرورِ عالم ﷺ سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھی۔ حضور پر نورؐ کے بہت سے ظاہری و باطنی اوصاف ان کی ذات میں موجود تھے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ شکل و صورت میں حضرت فاطمہؓ اپنی والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے بہت مشابہ تھیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول ہے کہ میں نے طور و طریق کی خوبی، اخلاق و کردار کی پاکیزگی، نشست و برخاست، طرز گفتگو اور لب و لہجہ میں رسول اللہ ﷺ کے مشابہ فاطمہؓ سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کی رفتار بھی بالکل رسول اللہ ﷺ کی رفتار تھی۔

اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ فاطمہؓ رفتار و گفتار میں رسول اللہ ﷺ کا بہترین نمونہ تھیں۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم سب بیویاں آپؐ کے پاس بیٹھی تھیں کہ فاطمہؓ سامنے سے آئیں، بالکل رسول اللہ ﷺ کی چال تھی۔ ذرا بھی فرق نہ تھا۔ آپؐ نے بڑے تپاک سے بلا کر (مرحبایا بنتی کہہ کر) پاس بٹھالیا۔ پھر آپؐ نے ان کے کان میں کچھ فرمایا، وہ رونے لگیں۔ ان کو روتے دیکھ کر آپؐ نے پھر ان کے کان میں کچھ کہا، وہ ہنسنے لگیں۔

میں نے فاطمہ سے کہا، فاطمہ تمام بیویوں کو چھوڑ کر تم سے رسول اللہ ﷺ

اپنے راز کی باتیں کہتے ہیں اور تم روتی ہو۔ آپؐ جب تشریف لے گئے تو میں نے فاطمہؑ سے واقعہ (رونے اور ہنسنے کا سبب) پوچھا۔ انہوں نے کہا، میں ابا جان کا راز فاش نہیں کروں گی۔

جب رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے تو میں نے فاطمہؑ سے کہا، فاطمہ میرا تم پر جو حق ہے میں تم کو اس کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ اس دن کی بات مجھ سے کہہ دو۔ انہوں نے کہا، ہاں اب ممکن ہے، میرے رونے کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ نے اپنی جلد وفات کی خبر دی تھی اور ہنسنے کا سبب یہ تھا کہ آپؐ نے فرمایا، فاطمہ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تم دنیا کی عورتوں کی سردار ہو۔ (سیرۃ عائشہؓ بحوالہ صحیحین)

سیدہ فاطمہؑ ہمیشہ سچی اور صاف بات کہتی تھیں۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ نے ان کی صدق مقالی اور صاف گوئی کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے:

”میں نے فاطمہؑ کے والد بزرگوار رسول اللہ ﷺ کے سوا فاطمہؑ سے زیادہ سچا اور صاف گو کسی کو نہ دیکھا“۔ (الاستیعاب)



۱۔ بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیدہ فاطمہؑ کے رونے اور ہنسنے کا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب حضورؐ اپنے وصال سے پہلے شدید علیل تھے لیکن اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کسی اور موقع پر پیش آیا۔ اس وقت حضورؐ چل پھر لیتے تھے کیونکہ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضورؐ اٹھ کر تشریف لے گئے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؑ سے واقعہ پوچھا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

عبادت اور شب بیداری

سیدہ فاطمہ الزہراءؑ کو عبادتِ الہی سے بے انتہا شغف تھا۔ وہ قائم اللیل اور دائم الصوم تھیں۔ خوفِ الہی سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتی تھیں۔ مسجد نبوی کے پہلو میں گھر تھا۔ سرورِ عالم ﷺ کے ارشادات و مواعظ گھر بیٹھے سنا کرتی تھیں۔ ان میں عقوبت اور محاسبہء آخرت کا ذکر آتا تو ان پر ایسی رقت طاری ہوتی کہ روتے روتے غش آجاتا تھا۔ تلاوتِ قرآن کرتے وقت عقوبت و عذاب کی آیات آجاتیں تو جسمِ اطہر پر کپکپی طاری ہو جاتی اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو جاتا ہے۔

زبان پر اکثر اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری رہتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں فاطمہ کو دیکھتا تھا کہ کھانا پکاتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ خدا کا ذکر کرتی جاتی تھیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ کا بیان ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراءؑ گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں اور قرآن پڑھتی رہتی تھیں۔ وہ چکی پیستے وقت بھی (کوئی گیت گانے کی بجائے) قرآنِ پاک پڑھتی رہتی تھیں۔

علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں ان کی اسی عادت کی طرف اشارہ کیا ہے:

آں ادب پروردہ صبر و رضا آسیا گردان و لب قرآن سرا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بیان ہے کہ فاطمہ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا عبادت کرتی تھیں لیکن گھر کے کام دھندوں میں فرق نہ آنے دیتی تھیں۔

سیدنا حضرت حسنؓ بن علیؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنی والدہ ماجدہ کو (گھر کے کام دھندوں سے فرصت پانے کے بعد) صبح سے شام تک محرابِ عبادت میں

اللہ تعالیٰ کے آگے گریہ و زاری کرتے، نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اس کی حمد و ثنا کرتے اور دعائیں مانگتے دیکھا کرتا تھا۔ یہ دعائیں وہ اپنے لیے نہیں بلکہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے مانگتی تھیں۔

عبادت کرتے وقت سیدہ فاطمہؓ کا نورانی چہرہ زعفرانی ہو جاتا تھا۔ جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی یہاں تک کہ اکثر مصلے آنسوؤں سے بھیگ جاتا تھا۔

ایک اور روایت میں حضرت حسنؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات میری مادرِ گرامی نماز کے لیے اپنی گھریلو مسجد کی محراب میں کھڑی ہوئیں اور ساری رات نماز میں مشغول رہیں، اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ مادرِ گرامی نے مومنین اور مومنات کے لیے بہت دعائیں مانگیں مگر اپنے لیے کوئی دعا نہ مانگی۔

میں نے عرض کیا ”اماں جان آپ نے سب کے لیے دعا مانگی لیکن اپنے لیے کوئی دعا نہ مانگی؟“

فرمایا: ”بیٹا پہلا حق باہر والوں کا ہے اس کے بعد گھر والوں کا“۔ (مدارج النبوة)

حضرت خواجہ حسن بھریؒ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراءؑ کی عبادت کا یہ حال تھا کہ اکثر ساری ساری رات نماز میں گزار دیتی تھیں۔

بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ الزہراءؑ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی عبادتِ الہی کو ترک نہ کرتی تھیں۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کے احکام کی تعمیل، اس کی رضا جوئی اور سنتِ نبویؐ کی پیروی ان کے رگ و ریشے میں سما گئی تھی۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے اور گھر گرہستی کے کام کاج کرتے ہوئے بھی اللہ کی ہو کر رہ گئی تھیں۔

اسی لیے ان کا لقب بتول پڑ گیا تھا۔

علم و فضل

حضرت فاطمہ الزہراءؑ کے قرآن حکیم سے شغف کا ذکر ان کی عبادت اور شب بیداری کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ چونکہ انہوں نے کچھ زیادہ عمر نہیں پائی اس لیے حدیث روایت کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ ان سے صرف اٹھارہ (بروایت دیگر انیس) احادیث مروی ہیں۔ ان سے حدیث روایت کرنے والوں میں حضرت علیؑ بن ابی طالب، اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت اُمّ ہانی اور حضرت سلمیٰ اُمّ رافعؓ شامل ہیں۔

امام دارقطنیؒ نے حضرت فاطمہؑ سے مروی احادیث پر مشتمل ایک کتاب تیار کی تھی جس کا نام مُسندِ فاطمہؑ رکھا تھا۔

تفقه فی الدین سے بھی بہرہ ور تھیں۔ مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ان کے ہاں گوشت تناول فرما رہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ حضورؐ اسی طرح نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت فاطمہؑ نے کسی موقع پر آپؐ کا کوئی ارشاد سنا تھا جس سے وہ سمجھی تھیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے انہوں نے حضورؐ کا دامنِ اقدس پکڑ کر عرض کی:

”ابا جان وضو کر لیجئے۔“

آپؐ نے فرمایا: ”جانِ پدر، وضو کی ضرورت نہیں، تمام اچھے کھانے آگ ہی

پر تو پکتے ہیں۔“

مُسْنَدِ اَحْمَد ہی میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کَرَم اللہ وجہہ کسی سفر میں گئے تھے۔ واپس تشریف لائے تو حضرت فاطمہؓ نے قربانی کا گوشت پیش کیا۔ ان کو اس کے کھانے میں عذر ہوا۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا، اس کے کھانے میں کچھ ہرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دے دی ہے۔

ایک مرتبہ سرورِ عالم ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے پوچھا ”بیٹی ذرا بتاؤ تو عورت کی سب سے اچھی صفت کون سی ہے؟“
حضرت فاطمہؓ نے جواب دیا:

”عورت کی سب سے اچھی صفت یہ ہے کہ نہ وہ کسی غیر مرد کو دیکھے

اور نہ کوئی غیر مرد اس کو دیکھے۔ (احیاء العلوم امام غزالی)

”دائرۂ معارف اسلامیہ“ میں ہے کہ — ”حضرت فاطمہؓ شعر بھی کہتی

تھیں۔“ (ان اشعار میں سے بعض کے لیے دیکھئے: —

علی فہمی: حسن الصحابہ، استانبول ۱۳۲۴ھ ص ۱۲۶ نیز عبدالقیوم: فہرست شعراء

لسان العرب)

بعض مواعظ جنہیں حضرت فاطمہؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے بعد کے

زمانے میں فارسی زبان میں ترجمہ اور شرح کیے گئے ہیں۔

(دیکھئے الممعة البیضاء ایران ۱۹۹۷ھ نیز دیکھئے معجم المطبوعات

اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۱۵ ص ۹۶، دانش گاہ پنجاب، لاہور)



۱۔ اس سے پہلے ایک موقع پر حضورؐ نے قربانی دینے والوں کو قربانی کا گوشت کھانے سے منع فرمایا تھا بعد میں حضورؐ نے اجازت دے دی لیکن حضرت علیؓ کو اس کا علم نہیں تھا۔

زُہد و قناعت

جس زمانے میں فتوحات اسلام روز بروز وسعت پذیر ہو رہی تھیں، مدینہ منورہ میں بکثرت مالِ غنیمت آنا شروع ہو گیا تھا۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ فاتح کو لڑائی کے بعد جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا اس کا تین چوتھائی لشکر کا حصہ ہوتا اور ایک چوتھائی فریقِ غالب کے سردار کا۔ رسول اکرمؐ نے حکم الہی **إِنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ خُسْهُهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ** (یعنی اے مسلمانو جان رکھو کہ جو مال تم لڑائی میں لوٹ کر لاؤ اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا اور رسول کے قرابت داروں کا اور یتیموں اور مسکینوں کا حق ہے) کے مطابق اس رواج میں تبدیلی کر دی اور صرف پانچواں حصہ اپنے پاس رکھ کر چار حصے عامۃ المسلمین میں تقسیم کر دیتے۔ اپنا حصہ بھی حضورؐ سب راہِ خدا میں صرف کر دیتے اور فقر و فاقہ اور قناعت سے اپنی زندگی گزارتے حتیٰ کہ ازواجِ مطہرات اور اپنی لختِ جگر فاطمہ الزہراءؑ کے لیے بھی آپؐ نے آسائش کا کوئی انتظام نہ فرمایا، اگر کبھی سیدہ فاطمہؑ اشارۃً کنایۃً لونڈی یا کنیز کے لیے استدعا کرتیں تو حضورؐ فرماتے — ”بیٹی فقراء اور یتامیٰ کا حق فائق ہے“۔ کبھی ان کی دوسرے طریقوں سے سمجھا بچھا کر تسلی و تشفی فرما دیتے۔

ایک دفعہ رسول اکرمؐ کے پاس مالِ غنیمت میں کچھ غلام اور لونڈیاں آئیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے سیدہ فاطمہؑ سے فرمایا:

”فاطمہ چکی پیتے پیتے تمہارے ہاتھوں میں آبلے (گھٹے) پڑ گئے ہیں اور چولہا پھونکتے پھونکتے تمہارے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا ہے۔ آج حضور کے پاس مالِ غنیمت میں بہت سی لونڈیاں آئی ہیں جاؤ اپنے ابا جان سے ایک لونڈی مانگ لاؤ۔“

سیدہ فاطمہ الزہراء رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں لیکن شرم و حیا حرفِ مدعا زبان پر لانے میں مانع ہوئی۔ تھوڑی دیر بارگاہِ نبوی میں حاضر رہ کر گھر واپس آ گئیں اور حضرت علیؑ سے کہا کہ مجھے حضور سے کینر مانگنے کی ہمت نہیں پڑتی آپ میرے ساتھ چلیں۔ چنانچہ دوسرے دن دونوں میاں بیوی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنی تکالیف بیان کیں اور ایک لونڈی کے لیے درخواست کی۔ حضور نے فرمایا: ”میں تم کو کوئی لونڈی خدمت کے لیے نہیں دے سکتا۔ ابھی اصحاب صفہ کی خور و نوش کا تسلی بخش انتظام مجھے کرنا ہے میں ان لوگوں کو کیسے بھول جاؤں جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر فقر و فاقہ اختیار کیا ہے۔ حضور کا ارشاد سن کر دونوں میاں بیوی خاموشی سے اپنے گھر چلے گئے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ سیدہ فاطمہ لونڈی مانگنے کے لیے سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو وہاں لوگوں کا مجمع دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ ان کے مزاج میں شرم و حیا بہت زیادہ تھی۔ آخر اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ سے اپنی ضرورت کا اظہار کر کے واپس آ گئیں۔ اُمّ المؤمنین نے حضور تک یہ بات پہنچائی تو دوسرے دن حضور خود حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے اور سیدہ سے پوچھا:

”فاطمہ“ کل تم کس غرض کے لیے میرے پاس گئی تھیں۔“

سیدہ شرم کے مارے اب بھی کچھ عرض نہ کر سکیں۔ اس موقع پر حضرت علیؑ

نے عرض کیا:

”یا رسول اللہ فاطمہ کی یہ حالت ہے کہ چکی پیتے پیتے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں۔ مشک بھرنے سے سینے پر رسی کے نشان ہو گئے ہیں۔ ہر وقت گھر کے کاموں میں مصروف رہنے سے کپڑے میلے ہو جاتے ہیں کل میں نے ان سے کہا تھا کہ آج کل حضورؐ کے پاس مالِ غنیمت میں لونڈیاں آئی ہوئی ہیں تم جا کر اپنی تکلیف بیان کرو اور ایک لونڈی مانگ لاؤ تا کہ تمہاری تکلیف کچھ ہلکی ہو جائے۔ یہی درخواست لے کر یہ کل آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں۔“

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ”بیٹی بدر کے شہیدوں کے یتیم تم سے پہلے مدد کے حقدار ہیں۔“

پھر آپؐ نے فرمایا، ”تم جس چیز کی خواہش مند تھیں اس سے بہتر ایک چیز میں تم کو بتاتا ہوں۔ ہر نماز کے بعد دس دس بار سُبْحَانَ اللَّهِ. اَلْحَمْدُ لِلَّهِ اور اللَّهُ اَكْبَرُ پڑھا کرو۔ اور سوتے وقت تینتیس مرتبہ سُبْحَانَ اللَّهِ تینتیس مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ اور چونتیس مرتبہ اللَّهُ اَكْبَرُ پڑھا لیا کرو۔ یہ عمل تمہارے لیے لونڈی اور غلام سے بڑھ کر ثابت ہوگا۔“

سیدہ فاطمہؑ نے عرض کیا، ”میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے اسی حال میں راضی ہوں۔“

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ فاطمہؑ کو لونڈی نہیں دی گئی لیکن وہ بالکل مطمئن ہو گئیں اور حسبِ سابق خوشدلی کے ساتھ اپنے کام کاج میں مصروف رہنے لگیں۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس واقعہ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال	گھر میں کوئی کنیر نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں	چکی کے پینے کا جو دن رات کام تھا

۱۔ یہ وظیفہ ”تسبیح فاطمہ“ کے نام سے مشہور ہے۔

گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
جھاڑو کا مشغلہ بھی ہر صبح شام تھا
یہ بھی کچھ اتفاق وہاں اذن عام تھا
واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا
کل کس لیے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا
حیدر نے اُن کے منہ سے کہا جو پیام تھا
جن کا صفء نبوی میں قیام تھا
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
میں اس کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
جرات نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

سینہ پہ مشک بھر کے جولاتی تھیں بار بار
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے
آخر گئیں جناب رسول خدا کے پاس
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے
غیرت یہ تھی کہ لب بھی نہ کچھ منہ سے کہہ سکیں
ارشاد یہ ہوا کہ غریبان بے وطن
میں اُن کے بند دست سے فارغ نہیں ہنوز
جو جو مصیبتیں کہ اب اُن پر گزرتی ہیں
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم تھا ان کا حق
خاموش ہو کے سیدہ پاک رہ گئیں

یوں کی بسر ہر اہل بیت مطہر نے زندگی

یہ ماجرائے دختر خیر الانام تھا

ایک دفعہ حضرت فاطمہ الزہراءؑ مسجد نبوی میں تشریف لائیں اور روٹی کا ایک

ٹکڑا سرورِ عالم ﷺ کو دیا۔ حضور نے پوچھا۔ ”یہ کہاں سے آیا ہے۔“

سیدہ نے عرض کیا: ”ابا جان تھوڑے سے جو پیس کر روٹی پکائی تھی، جب

بچوں کو کھلا رہی تھی خیال آیا کہ ابا جان کو بھی تھوڑی سی کھلا دوں معلوم نہیں وہ کس

حال میں ہوں، اے خدا کے رسول برحق یہ روٹی تیسرے وقت نصیب ہوئی ہے۔“

سرکارِ دو عالم نے روٹی تناول فرمائی اور سیدہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”اے میری بچی چار وقت کے بعد روٹی کا پہلا ٹکڑا ہے جو تیرے باپ

کے منہ میں پہنچا ہے۔“

ایک دفعہ سیدۃ النساءؑ بیمار ہو گئیں۔ رسول اکرم ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ نے اپنے ایک جاں نثار حضرت عمران بن حصین کو ساتھ لیا اور اپنی لختِ جگر کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ دروازے پر پہنچ کر داخلے کی اجازت مانگی۔ اندر سے سیدہ کی آواز آئی ”تشریف لائیے“۔

حضور نے فرمایا ”میرے ساتھ عمران بن حصین بھی ہیں“۔
سیدہ نے عرض کیا ”ابا جان! اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو سچا رسول بنا کر بھیجا ہے میرے پاس ایک عبا کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہیں ہے کہ پردہ کروں“۔
حضور نے اپنی چادر مبارک اندر پھینک دی اور فرمایا، ”بیٹی اس سے پردہ کرلو“۔

اس کے بعد حضور اور حضرت عمرانؓ اندر تشریف لے گئے اور سیدہ سے ان کا حال پوچھا۔

سیدہ نے عرض کی ”ابا جان شدتِ درد سے بے چین ہوں اور بھوک سے نڈھال ہوں کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔“

حضور نے فرمایا، ”اے میری بچی صبر کر، میں بھی آج تین دن سے بھوکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے میں جو کچھ مانگتا وہ ضرور مجھے عطا کرتا لیکن میں نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی“۔ پھر حضور نے اپنا دستِ شفقت حضرت فاطمہ الزہراءؑ کی پشت پر پھیرا اور فرمایا:

”اے لختِ جگر دنیا کے مصائب سے دل شکستہ نہ ہو، تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو“۔

ایک دفعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور سیدہ فاطمہ الزہراءؑ دونوں آٹھ پہر سے بھوکے تھے۔ شام کے قریب ایک تاجر کے اونٹ آئے اسے اونٹوں سے سامان

اتروانے کے لیے ایک مزدور کی ضرورت تھی۔ حضرت علیؑ نے اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور پہر رات تک اس کے اونٹوں کا سامان اتارا۔ تاجر نے ایک درہم محنت کا معاوضہ دیا۔ چونکہ رات زیادہ آچکی تھی اس لیے خورونوش کی دکانیں بند ہو چکی تھیں تاہم ایک دوکان سے جو مل گئے۔ شیر خدا ایک درہم کے جو لے کر گھر آئے، سیدہ فاطمہؑ دیر سے راہ تک رہی تھیں۔ شوہر نامدار کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں۔ جو ان سے لے کر چکی میں پیسے، پھر ان کو گوندھا، آگ جلائی اور روٹی پکا کر علی مرتضیٰؑ کے سامنے رکھ دی جب وہ کھا چکے تو خود کھانے بیٹھیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ مجھے اس وقت سید البشرؑ کا یہ قول مبارک یاد آیا کہ فاطمہ دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ہے۔

ایک دن رسول اکرم ﷺ کے خانہ اقدس میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہراءؑ کے گھر کا بھی یہی حال تھا۔ حضورؐ بھوک کی حالت میں کاشانہ اقدس سے باہر نکلے۔ راستے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ مل گئے۔ اتفاق سے وہ بھی اس دن فاقہ سے تھے۔ حضورؐ ان دونوں کو ساتھ لے کر حضرت ابویوبؓ انصاری کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت ابویوبؓ اپنے کھجوروں کے باغ میں گئے ہوئے تھے اور گھر میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ حضرت ابویوبؓ کی زوجہ محترمہ نے حضورؐ کو اہلا وسہلاً کہا۔ حضورؐ نے پوچھا، ”ابویوب کہاں ہیں؟“

حضرت ابویوبؓ کا باغ مکان کے بالکل قریب تھا انہوں نے رحمت عالم ﷺ کی آواز سنی تو کھجوروں کا ایک گچھا توڑ کر بے تابانہ دوڑتے ہوئے گھر پہنچے اور یہ گچھا مہمانانِ عزیز کی خدمت میں پیش کیا، اس کے ساتھ ہی فوراً ایک بکری ذبح کی۔ آدھے گوشت کا سالن پکوا یا اور آدھے کے کباب بنوائے اور حضورؐ

کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ حضورؐ نے ایک روٹی پر کچھ گوشت رکھ کر فرمایا:
 ”اسے فاطمہ کو بھیج دو اس پر کئی دن کا فاقہ ہے۔“
 حضرت ابو ایوبؓ نے تعمیل ارشاد کی اور حضورؐ نے اپنے رفقاء کرام کے
 ساتھ کھانا کھایا۔ یہ پر تکلف کھانا کھاتے ہوئے حضورؐ پر رقت طاری ہو گئی اور
 آپؐ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن بندوں سے دنیاوی نعمتوں
 کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ (یعنی ان نعمتوں کا حق تم نے کیسے
 ادا کیا)۔

حضرت فاطمہ الزہراءؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے
 میرے پاس آ کر دریافت فرمایا، ”میرے دونوں بیٹے حسنؓ و حسینؓ کہاں ہیں؟“
 میں نے عرض کیا، ”ابا جان آج صبح ہمارے گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز
 نہ تھی، علیؓ نے مجھ سے کہا کہ میں ان دونوں بچوں کو ساتھ لے کر فلاں یہودی کے
 پاس (مزدوری کے لیے) جا رہا ہوں، ایسا نہ ہو کہ یہ بچے کھانے کے لیے
 روئیں۔“

رسول اللہ ﷺ اس طرف تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ دونوں بچے ایک حوض
 کے پاس کھیل رہے ہیں اور ان کے قریب چند کھجوریں رکھی ہوئی ہیں۔
 آپؐ نے فرمایا، ”اے علیؓ اس سے پہلے کہ دھوپ تیز ہو جائے ان بچوں کو
 واپس گھر لے جاؤ۔“

حضرت علیؓ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ صبح سے گھر میں کھانے کے لیے کوئی
 چیز نہیں ہے۔ آپؐ تھوڑی دیر تشریف رکھیں میں درخت سے گری ہوئی کھجوریں
 فاطمہ کے لیے بھی چن لوں۔“ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کچھ دیر کے لیے رُک گئے اور

اس اثناء میں حضرت علیؑ نے میرے لیے کھجوریں چن کر ایک کپڑے میں ڈال لیں اور چل پڑے۔ بچوں میں سے ایک کو رسول اللہ ﷺ نے اٹھالیا اور ایک کو حضرت علیؑ نے اور اسی طرح سب گھر پہنچے۔ (طبرانی، بیہمی)

حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم پر کئی دن ایسے گزر گئے کہ نہ تو ہمارے پاس کھانے کی کوئی چیز تھی اور نہ رسول اللہ ﷺ کے پاس۔ اسی زمانے میں ایک دن میں کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک دینار پڑا پایا۔ تھوڑی دیر میں نے سوچا کہ اسے اٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں۔ آخر میں نے اسے اٹھالیا کیونکہ سخت مصیبت (تنگدستی) میں مبتلا تھے۔ اسے لے کر ایک دوکاندار کے پاس آیا اور آٹا خرید کر فاطمہؑ کے پاس لے گیا اور ان سے کہا، اسے گوندھو اور روٹی پکاؤ۔ انہوں نے آٹا گوندھنا شروع کیا۔ اس وقت بھوک کی وجہ سے ان کی کمزوری کی یہ کیفیت تھی کہ کمر جھک گئی تھی اور ان کی پیشانی کے بال لگن تک پہنچ رہے تھے۔ بہر حال انہوں نے جوں توں کر کے آٹا گوندھا اور روٹی پکائی پھر میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا ”اسے کھا لو اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ رزق دیا ہے“۔ (کنز العمال - مسند ابوداؤد)

ایک دن سرورِ عالم ﷺ حضرت فاطمہ الزہراءؑ کے گھر تشریف لے گئے، آپؐ نے دیکھا کہ سیدۃ النساءؑ اونٹ کی کھال کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور اس میں بھی تیرہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ وہ آٹا گوندھ رہی ہیں اور زبان پر کلام اللہ کا ورد جاری ہے۔ حضورؐ یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:

”فاطمہ دنیا کی تکلیف کا صبر سے خاتمہ کر اور آخرت کی دائمی مسرت کا انتظار کر۔ اللہ تعالیٰ تمہیں نیک اجر دے گا۔“

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ سامنے سے حضرت فاطمہؓ آئیں اور بالکل حضورؐ کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ آپؐ نے فرمایا، اے فاطمہ قریب ہو، یہ ذرا قریب ہوئیں۔ آپؐ نے پھر فرمایا، اے فاطمہ قریب ہو، یہ ذرا اور قریب ہو گئیں۔ آپؐ نے فرمایا، اے فاطمہ قریب ہو۔ یہ آپؐ سے اور قریب ہو گئیں اور بالکل آپؐ کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور خون نہیں رہ گیا تھا۔ حضورؐ نے اپنی انگلیاں پھیلائیں پھر اپنی ہتھیلی حضرت فاطمہؓ کے سینہ پر رکھی اور اپنا سر مبارک اٹھا کر فرمایا، اے میرے اللہ، بھوکے کے پیٹ کو بھر دینے والے اور حاجت کو پورا کرنے والے اور گرے ہوئے کو بلند کرنے والے، فاطمہ بنت محمدؐ کو بھوکا نہ رکھ۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ بھوک کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کے چہرے پر جو پیلا پن تھا وہ جاتا رہا اور خون ظاہر ہو گیا۔ اس واقعہ کے چند دن بعد میں نے حضرت فاطمہؓ سے پوچھا، تو انہوں نے فرمایا کہ اے عمران مجھے اس وقت سے کبھی بھوک نے نہیں ستایا۔

(طبرانی)



ایشارو سخاوت

ایک دفعہ قبیلہ بنو سلیم کے ایک بہت بوڑھے آدمی رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضورؐ نے انہیں دین کے ضروری احکام و مسائل بتائے اور پھر ان سے پوچھا:

”کیا تمہارے پاس کچھ مال بھی ہے؟“

انہوں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ — قسم ہے اللہ کی“ بنو سلیم کے تین ہزار آدمیوں میں سب سے زیادہ غریب اور محتاج میں ہی ہوں۔“

حضورؐ نے صحابہؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

”تم میں سے کون اس مسکین کی مدد کرے گا؟“

سید الخزرج حضرت سعد بن عبادہ اٹھے اور کہا: — یا رسول اللہ میرے پاس ایک اونٹنی ہے جو میں اس کو دیتا ہوں۔“

حضورؐ نے فرمایا: ”تم میں سے کون ہے جو اس کا سر ڈھانک دے؟“

سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ اٹھے اور اپنا عمامہ اتار کر نو مسلم اعرابی کے سر پر رکھ

دیا۔

پھر حضورؐ نے فرمایا: ”کون ہے جو اس کی خوراک کا بندوبست کرے؟“

حضرت سلمان فارسیؓ نے ان صاحب کو ساتھ لیا اور ان کی خوراک کا انتظام کرنے لگے۔ چند گھروں سے دریافت کیا لیکن وہاں سے کچھ نہ ملا۔ آخر سیدہ

فاطمۃ الزہراءؑ کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا — سیدہؑ نے پوچھا، کون ہے؟
حضرت سلمانؓ نے سارا واقعہ بیان کیا اور التجا کی ”اے سچے رسولؐ کی بیٹی،
اس مسکین کی خوراک کا بندوبست کیجیے۔“

سیدہ عالمؑ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: — اے سلمان، خدا کی قسم آج سب کو
تیسرا فاقہ ہے۔ دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں لیکن سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دوں
گی — جاؤ یہ میری چادر شمعون یہودی کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ فاطمہ
بنت محمدؐ کی یہ چادر رکھ لو اور اس کے عوض اس مسکین کو کچھ جنس دے دو۔“

حضرت سلمانؓ اعرابی کو ساتھ لے کر شمعون کے پاس پہنچے اور اس سے تمام
کیفیت بیان کی۔ وہ دریائے حیرت میں غرق ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا
کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں —
سیدہ عالمؑ کے پاکیزہ کردار کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ وہ بے اختیار پکار اٹھا۔

”اے سلمان خدا کی قسم یہ وہی لوگ ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی
ہے۔ تم گواہ رہنا کہ میں فاطمہؑ کے باپ پر ایمان لایا۔“

اس کے بعد کچھ غلہ حضرت سلمانؓ کو دیا اور چادر بھی سیدہ فاطمہؑ کو واپس بھیج
دی۔ وہ سیدہؑ کے پاس واپس آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے انانج پیسا اور
جلدی سے اعرابی کے لیے روٹیاں پکا کر حضرت سلمانؓ کو دیں۔ انہوں نے کہا،
”اے میرے آقا کی لختِ جگر ان میں سے کچھ بچوں کے لیے رکھ لیجیے۔“

سیدۃ النساءؑ نے جواب دیا:

”سلمان جو چیز میں راہِ خدا میں دے چکی وہ میرے بچوں کے لیے
جائز نہیں۔“

حضرت سلمانؓ روٹیاں لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے
وہ روٹیاں اعرابی کو دیں اور پھر حضرت فاطمہ الزہراءؑ کے گھر تشریف لے گئے۔

ان کے سر پر اپنا دستِ شفقت پھیرا، آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کی: —
 ”بارِ الہا فاطمہ تیری کنیز ہے اس سے راضی رہنا۔“

علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے

بہر محتاجے دلش آں گو نہ سوخت

با یہودی چادرِ خود را فروخت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے ساری رات ایک باغ سینچا اور اجرت میں تھوڑے سے جو حاصل کیے۔ سیدہ فاطمہؓ نے ان کا ایک حصہ لے کر آٹا پیسا اور کھانا تیار کیا۔ عین کھانے کے وقت ایک مسکین نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا، ”میں بھوکا ہوں“ حضرت سیدہؓ نے وہ سارا کھانا اسے دے دیا۔ پھر باقی اناج میں سے کچھ حصہ پیسا اور کھانا پکایا۔ ابھی کھانا پک کر تیار ہوا ہی تھا کہ ایک یتیم نے دروازہ پر آ کر دستِ سوال دراز کیا۔ وہ سب کھانا اُسے دے دیا۔ پھر انہوں نے باقی اناج پیسا اور کھانا تیار کیا۔ اس مرتبہ ایک مشرک قیدی نے اللہ کی راہ میں کھانا مانگا — وہ سب کھانا اس کو دے دیا۔ غرض سب اہل خانہ نے اس دن فاقہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اس گھر کے قدسی صفات مکینوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الدھر)

(اور وہ اللہ کی راہ میں مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

ایک دفعہ کسی نے سیدہ فاطمہؓ سے پوچھا، چالیس اونٹوں کی زکوٰۃ کیا ہوگی؟

سیدہؓ نے فرمایا:

”تمہارے لیے صرف ایک اونٹ اور اگر میرے پاس چالیس اونٹ

ہوں تو میں سارے ہی راہِ خدا میں دے دوں۔“

سیدنا حضرت حسنؑ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک وقت کے فاقہ کے بعد ہم سب کو کھانا میسر ہوا۔ والدِ بزرگوار (حضرت علی کریم اللہ وجہہ) حسینؑ اور میں کھا چکے تھے لیکن والدہ ماجدہ (سیدۃ النساء) نے ابھی نہیں کھایا تھا۔ انہوں نے ابھی روٹی پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ دروازے پر ایک سائل نے صدا دی ”رسول اللہ کی بیٹی میں دو وقت کا بھوکا ہوں میرا پیٹ بھر دو“۔ والدہ محترمہ نے فوراً کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا اور مجھ سے فرمایا ”جاو یہ کھانا سائل کو دے آؤ، مجھے تو ایک ہی وقت کا فاقہ ہے اور اس نے دو وقت سے نہیں کھایا“۔



شرم و حیا

سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ پردہ کی نہایت پابند تھیں اور حد درجہ حیا دار تھیں۔ ایک بار سرورِ عالم ﷺ نے انہیں طلب فرمایا تو وہ شرم سے لڑکھڑاتی ہوئی آئیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے ان سے پوچھا، بیٹی عورت کی سب سے اچھی صفت کون سی ہے تو انہوں نے عرض کیا:

”عورت کی سب سے اعلیٰ خوبی یہ ہے کہ نہ وہ کسی غیر مرد کو دیکھے اور نہ کوئی غیر مرد اس کو دیکھے“۔^۱

ایک مرتبہ سیدہ فاطمہؓ حضورؐ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئیں کہ آپؐ سے کوئی لونڈی طلب کریں لیکن فرطِ حیا سے دل کی بات زبان پر نہ لاسکیں اور بغیر کچھ کہے واپس آگئیں۔

ایک دفعہ حضورؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ آپؐ کے پیچھے ایک نابینا صحابی حضرت ابنِ اُمّ مکتومؓ بھی اندر چلے گئے۔ سیدہ فاطمہؓ انہیں دیکھ کر کوٹھڑی میں چھپ گئیں، جب وہ چلے گئے تو حضورؐ نے فرمایا، بیٹی تم چھپ کیوں گئی تھیں۔ ابنِ اُمّ مکتومؓ تو اندھے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا، بابا جان اگر وہ اندھے ہیں تو میں تو ایسی نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ غیر مرد کو دیکھا کروں۔

شرم و حیا کی انتہا یہ تھی کہ عورتوں کا جنازہ بغیر پردہ کے نکلنا پسند نہ تھا۔ اسی

۱۔ سیدہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جان بوجھ کر نامحرم مردوں کو شوق سے نہ دیکھا جائے۔ (ان پر اتفاقہ نظر پڑنا یا کسی دینی ضرورت کے تحت ان کو دیکھنا ناجائز نہیں)

بناء پر اپنی وفات سے پہلے وصیت کی کہ میرے جنازے پر کھجور کی شاخوں کے ذریعے کپڑے کا پردہ ڈال دیا جائے اور جنازہ کورات کے وقت اٹھایا جائے تاکہ اس پر غیر مردوں کی نظر نہ پڑے۔

سرورِ عالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے بڑھ کر کوئی انصاف پسند نہ تھا۔ آپ ہر معاملے میں پورے انصاف سے کام لیتے تھے۔ اپنی ازواجِ مطہرات کے معاملے میں آپ کا یہ معمول تھا کہ باری باری ہر ایک حجرے میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ اُمّ المؤمنین حضرت سودہ کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہ صدیقہ کو دے دی تھی اس لیے حضور ان کے حجرے میں دورات رہا کرتے تھے۔ صحابہ کرام اکثر حضرت عائشہ صدیقہ کی باری کے دونوں میں حضور کی خدمت میں تحائف اور ہدایا بھیجتے تھے۔ دوسری ازواج چاہتی تھیں کہ صحابہ ان کی باری کے دن بھی اسی طرح تحائف بھیجا کریں لیکن سب اس معاملے میں حضور سے براہ راست گفتگو کرنے میں جھجکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ حضرت فاطمہ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضور کی خدمت اقدس میں بھیجا جائے، کیونکہ آپ ان کو بہت مانتے ہیں۔ سیدہ فاطمہ حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، اپنی دوسری سوتیلی ماؤں کی درخواست پیش کی اور عرض کیا، ابا جان وہ سب حضرت صدیقہ کے معاملے میں آپ سے انصاف چاہتی ہیں۔

صحابہ کرام جو کچھ بھیجتے تھے اپنی خوشی سے بھیجتے تھے۔ حضور نے ان کو اس کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دی تھی، اس لیے بے انصافی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

”بیٹی جس کو میں چاہوں کیا تم اس کو نہیں چاہو گی۔“

حضرت فاطمہ شرما کر فوراً واپس چلی آئیں۔ ازواجِ مطہرات نے پھر اصرار کیا کہ بیٹی تم دوبارہ حضور کی خدمت میں جاؤ اور یہ معاملہ پیش کرو۔ سیدہ نے کہا، خدا کی قسم میں اس معاملے میں پھر ابا جان سے کچھ کہنے نہ جاؤں گی۔ (بخاری و مسلم)

انسانی ہمدردی

خیر الخلاق رحمتِ دو عالم کی تربیت نے سیدہ فاطمہ الزہراءؑ کے دل میں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ وہ بے حد مصروف خاتون تھیں۔ خانہ داری، بچوں کی نگہداشت، شوہر کی خدمت اور عبادت سے انہیں کسی دوسری طرف توجہ کرنے کی فرصت بالکل نہ ملتی تھی لیکن وہ حضورؐ کے ارشاد: أَحْسَنَ النَّاسِ خَادِمُ النَّاسِ (لوگوں میں سب سے بہتر وہ انسان ہے جو دوسروں کی خدمت بجالاتا ہے) کے پیش نظر ہر وقت مخلوقِ خدا کی خدمت پر کمر بستہ رہتی تھیں اور اڑوسیوں پڑوسیوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔

ان کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا جو اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اللہ نے اسے ہدایت دی اور وہ مشرف بہ ایمان ہو گیا۔ اس پر اس کے خویش و اقارب اس کے مخالف ہو گئے اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔ اس طرح اس کے کاروبار اور تجارت پر بہت بُرا اثر پڑا اور وہ نہایت مفلس و قلاش ہو گیا۔ اسی زمانے میں اس کی ہمدردی اور غمگسار بیوی قضائے الہی سے فوت ہو گئی۔ رشتہ داروں میں سے کوئی اس کے قریب بھی نہ پھٹکا۔ گھر میں بیوی کی میت پڑی تھی اور وہ پریشان تھا کہ اس کے غسل و کفن کا کیا انتظام کیا جائے۔ اتفاق سے سیدہ فاطمہ الزہراءؑ کو اس کی مصیبت کا علم ہو گیا۔ وہ رات کے اندھیرے میں اٹھیں، ردائے مبارک سر پر لی

اور لونڈی (حضرت فضہؓ) کو ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچیں، وہاں جا کر خود ہی میت کو غسل دیا اور خود ہی کفنا یا۔

(خاتونِ جنت، منشی تاج الدین احمد تاج مرحوم)

ایک مرتبہ چکی پیس رہی تھیں کہ پڑوس سے ایک دردناک آواز کانوں میں پڑی۔ یہ آواز سنتے ہی بے چین ہو گئیں۔ کنیز کو ساتھ لے کر فوراً اس گھر میں چلی گئیں، دیکھا کہ پڑوسن درِ دِزہ میں مبتلا ہے اور اس کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ گھر والے سخت پریشان ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ سیدہؓ نے انہیں تسلی دی اور کنیز کے ساتھ مل کر زچہ کی اس تندہی سے مدد اور خدمت کی کہ بچہ صحیح سلامت پیدا ہو گیا اور زچہ کی جان بھی بچ گئی۔ یہ خدمت انجام دے کر گھر لوٹیں تو اس قدر خوش تھیں گویا سارے جہان کی نعمتیں مل گئی ہوں۔

(سیرتِ فاطمہ الزہراءؓ، مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم)



رسولِ پاک کی فرمانبرداری

سیدہ فاطمہ الزہراءؑ ایک مسلمان خاتون ہونے کی حیثیت سے رسولِ پاکؐ کی امت کا ایک فرد بھی تھیں اور حضورؐ کی چہیتی بیٹی بھی تھیں۔ ان دونوں حیثیتوں میں وہ رسولِ پاکؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری کو اپنا جزو ایمان سمجھتی تھیں وہ ہر کام میں حضورؐ کی پیروی کرتیں، ہر عمل اسی طرح سرانجام دیتیں جس طرح حضورؐ سرانجام دیتے۔ حضورؐ سے کوئی مسئلہ، حکم یا ارشاد سن پاتیں تو اس کو حرزِ جان بنا لیتیں اور اسی کے مطابق عمل کرتیں۔

ایک دفعہ حضرت علیؑ کو کہیں سے کچھ رقم مل گئی (قیاس یہ ہے کہ مالِ غنیمت سے ملی ہوگی) انہوں نے اس رقم سے سونے کا ایک ہار خرید لیا اور اسے سیدہ فاطمہؑ کو دے دیا۔ سرورِ عالم ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ بیٹی کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا: ”فاطمہ! کیا لوگوں سے یہ بہلانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی آگ کا ہار پہنتی ہے۔“

دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت فاطمہؑ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا:

”فاطمہ تم یہ ہار پہنے ہوئے ہو لوگ دیکھیں گے تو کیا یہ نہ کہیں گے کہ محمدؐ کی بیٹی مغرور امیروں کے سے زیور پہنتی ہے۔“

حضرت فاطمہؑ نے حضورؐ کا ارشاد سنا تو اسی وقت ہار گلے سے اتار دیا۔ پھر اس

کو فروخت کر کے ایک غلام خریدا اور اس کو آزاد کر دیا۔

محدثین نے یہ تصریح نہیں کی کہ حضورؐ نے ”سونے کے ہار“ کو ”آگ کا ہار“ کیوں قرار دیا، حالانکہ عورتوں کے لیے سونے کے زیور پہننا جائز ہے۔ قیاس یہ ہے کہ حضورؐ کو یہ پسند نہ تھا کہ آپؐ کے گھرانے کے لوگ پر تکلف لباس پہنیں یا قیمتی زیور استعمال کریں اور نمود و نمائش سے کچھ واسطہ رکھیں۔

ایک مرتبہ سرورِ کونینؓ کسی غزوہ سے واپس تشریف لائے۔ سیدہ فاطمہؓ نے آپؐ کی مراجعت کی خوشی میں یا خیر مقدم کے طور پر گھر کے دروازے پر نقشبیں پردہ لٹکا دیا۔ اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو چاندی کے کنگن پہنائے۔ حضورؐ معمول کے مطابق سب سے پہلے سیدہ فاطمہؓ سے ملنے تشریف لائے۔ آپؐ نے گھر کے دروازے پر پردہ اور بچوں کے ہاتھ میں نقرئی کنگن دیکھے تو سیدہ کے گھر میں داخل ہوئے بغیر واپس تشریف لے گئے۔ سیدہ حضورؐ کی واپسی کا سبب سمجھ گئیں انہوں نے فوراً پردہ چاک کر دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے، وہ روتے ہوئے نانا جانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا:

”یہ میرے گھرانے والے (اہل بیت) ہیں میں نہیں چاہتا کہ وہ ان زخارف (زرق برق آرائش) سے آلودہ ہوں۔ ان کے بدلے فاطمہؓ کے لیے عصب کا ہار اور نقرئی کنگنوں کی جگہ ہاتھی دانت کے دو جوڑے کنگن خرید لاؤ۔ (ابوداؤد نسائی)

ایک اور روایت میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے پاس باہر سے کچھ رقم بھیجی۔ اس زمانے میں حضورؐ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ آپؐ واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو سیدہ فاطمہؓ نے اس خوشی میں حضرت علیؓ کی بھیجی ہوئی رقم سے ایک پردہ خرید کر دروازے پر لٹکا دیا

۱۔ بعض روایتوں میں ایک سے زیادہ پردے بیان کیے گئے ہیں جن پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

اور چاندی کے دو کنگن بنوا کر ہاتھوں میں پہن لیے۔ حضورؐ واپس تشریف لائے تو حسب معمول سب سے پہلے حضرت فاطمہؑ سے ملنے گئے۔ انہوں نے نہایت مسرت سے حضورؐ کو اہلاً و سہلاً و مرحباً کہا لیکن حضورؐ نے دروازے پر پردہ اور ان کے ہاتھوں میں چاندی کے کنگن دیکھ کر ان کی طرف چنداں التفات نہ فرمایا اور کاشانہ فاطمہؑ میں تشریف رکھے بغیر واپس چلے گئے۔ حضرت فاطمہؑ کو حضورؐ کی بے اعتنائی سے بہت دکھ ہوا، وہ رونے لگیں اور سوچنے لگیں کہ آخر مجھ سے کون سا کام حضورؐ کی مرضی کے خلاف ہوا ہے؟ سوچتے سوچتے خیال آیا کہ یہی پردہ اور کنگن دو نئی چیزیں گھر میں آئی ہیں۔ انہوں نے فوراً کنگن ہاتھوں سے نکالے اور دروازے سے پردہ اتارا پھر یہ دونوں چیزیں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو دے کر فرمایا کہ انہیں نانا جان کے پاس لے جاؤ اور میری طرف سے عرض کرو کہ آپ ان کو جس طرح چاہیں، کام میں لائیں۔

بچے یہ چیزیں لے کر حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور ماں کا پیغام دیا تو آپؐ نے ان کو چوم کر اپنے زانوؤں پر بٹھالیا اور صحابہؓ کو حکم دیا کہ کنگنوں کو توڑ کر اور پردے کو بہت سے حصوں میں پھاڑ کر انہیں اصحابِ صفہ میں تقسیم کر دو۔ اس کے بعد آپؐ نے دعا کی:

”الہی! میری بیٹی فاطمہ کو اپنے فضل و کرم سے نواز۔ اس پردے کے بدلے جس سے صفہ کے محتاجوں کا تن ڈھانکا گیا، میری بیٹی کو جنت کے کپڑے عطا فرما اور ان کنگنوں کے بدلے جو ان غریب لوگوں میں تقسیم کیے گئے، اسے جنت کے زیور پہنا“۔ (اسوۃ حسنہ، سلمان منصور پوری)

غرض سیدہ فاطمہ الزہراءؑ ہمیشہ حضورؐ کی مرضی اور منشا کے مطابق عمل کرتی تھیں اور آپؐ کی رضا جوئی کو ہر چیز پر مقدم سمجھتی تھیں۔

باپ بیٹی کی محبت

سرورِ عالم ﷺ کو سیدہ فاطمہ الزہراءؑ سے بے انتہا محبت تھی اور سیدہؑ بھی حضورؐ سے والہانہ محبت کرتی تھیں۔ خادمِ رسول اللہ ﷺ حضرت انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے برابر کسی کو اپنی اولاد سے محبت کرتے نہیں دیکھا۔ جب کبھی آپؐ سفر پر تشریف لے جاتے تو حضرت فاطمہؑ سے مل کے جاتے اور جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے سیدہ فاطمہؑ سے آکر ملتے۔

اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ جب فاطمہؑ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو آپؐ ازراہِ محبت کھڑے ہو جاتے اور شفقت سے ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی نشست سے ہٹ کر اپنی جگہ پر بٹھاتے اور جب آپؐ فاطمہؑ کے گھر تشریف لے جاتے تو وہ بھی کھڑی ہو جاتیں، محبت سے آپؐ کا سر مبارک چومتیں اور اپنی جگہ پر بٹھاتیں۔ (ابوداؤد)

رسولِ اکرم ﷺ کے غلام حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کسی سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں سیدہ فاطمہؑ سے رخصت ہوتے اور سفر سے واپس تشریف لاتے تو خاندان بھر میں سب سے پہلے سیدہ فاطمہؑ ہی سے ملاقات کرتے پھر اپنے گھر تشریف لے جاتے۔ (مدارج النبوة)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ حضرت فاطمہؑ کے ہر رنج و راحت میں شریک ہوتے اور تقریباً ہر روز ان کے گھر جاتے۔ ان کی خبر گیری کرتے، کوئی تکلیف ہوتی

تو اسے دور کرنے کی کوشش فرماتے — اگر سرورِ عالم ﷺ کے گھر میں فقر و فاقہ ہوتا تو بیٹی کے گھر میں بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ حضورؐ کے گھر میں کوئی چیز چکتی تو آپؐ اس میں سے کچھ نہ کچھ حضرت فاطمہؓ کو بھی بھجاتے۔ اگر کہیں سے کوئی کھانے پینے کی چیز آجاتی تو آپؐ اس میں سے بھی سیدہ فاطمہؓ کا حصہ ضرور نکالتے اور ان کو بھجو دیتے کہیں سے کپڑا آتا تو وہ بھی بقدرِ مناسب سیدہؓ کو بھیجتے۔ اگر کہیں دعوت پر تشریف لے جاتے اور سیدہؓ گھر میں بھوکی ہوتیں تو میزبان کی اجازت سے ان کے لیے کچھ کھانا بھیج دیتے۔

حضرت ابو ثعلبہ نضلیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک غزوہ سے واپس تشریف لائے۔ پہلے آپؐ نے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھی۔ حضورؐ کو یہ بات زیادہ پسند تھی کہ جب کبھی سفر سے واپس ہوتے، پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا فرماتے اس کے بعد اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے پھر ازواجِ مطہرات کے یہاں۔ چنانچہ آپؐ دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد حضرت فاطمہؓ سے ملنے تشریف لے چلے۔ حضرت فاطمہؓ آپؐ کے استقبال کے لیے گھر کے دروازہ پر آگئیں اور آپؐ کا چہرہ مبارک چومنا شروع کر دیا۔ (بروایت دیگر آنکھ اور دہن مبارک کو چوما) اور رونے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا روتی کیوں ہو؟ عرض کیا، آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ مشقت سے متغیر اور پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر رونا آ گیا۔ آپؐ نے فرمایا، اے فاطمہؓ گریہ و زاری نہ کر تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے کام کے لیے بھیجا ہے کہ روئے زمین پر کوئی اینٹ اور گارے کا مکان اور نہ کوئی ادنیٰ سوتی خیمہ بچے گا جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ کام (دینِ اسلام) نہ پہنچا دے اور یہ دین وہاں تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک دن اور رات کی پہنچ ہے۔ (کنز العمال، طبرانی، بیہمی، حاکم)

مُسْنَدِ اَحْمَدِ بْنِ حَنْبَلٍ میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت فاطمہؓ نے (جب انہیں معلوم ہوا کہ حضورؐ فاقہ سے ہیں) جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے ان سے فرمایا، جان پدر یہ پہلا کھانا ہے جس کو تین دن کے بعد تیرا باپ کھائے گا۔ طبرانی میں یہ اضافہ ہے کہ جب حضرت فاطمہؓ نے آپؐ کو جو کی روٹی کا ٹکڑا دیا تو آپؐ نے پوچھا، بیٹی یہ کیا ہے؟ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا، ابا جان، یہ ٹکیہ ہے جس کو میں نے پکایا تھا، میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ میں اکیلی یہ ٹکیہ کھا لوں (در آنحالیکہ آپ بھوکے ہوں) اس میں سے یہ ٹکڑا آپؐ کی خدمت میں لائی ہوں۔

ایک روایت میں ہے کہ غزوة خندق (۵۔ ہجری) میں گھر کے مرد میدان میں تھے۔ ایک دن سیدہ فاطمہؓ نے روٹی پکائی اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ کو پیش کی۔ حضورؐ کئی دن سے خندق کی کھدائی میں مصروف تھے۔ بیٹی کی محبت پر خوش ہو کر فرمایا، جان پدر آج تین دن کے بعد یہ لقمہ مجھے ملا ہے۔

غزوة احد (۳۔ ہجری) میں سرورِ عالم ﷺ زخمی ہوئے تو بعض لوگ سمجھے کہ آپؐ شہید ہو گئے۔ یہ خبر مدینے پہنچی تو خواتین فرطِ غم سے نڈھال ہو گئیں اور بے اختیار گھروں سے نکل پڑیں۔ سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ بھی ان میں شامل تھیں۔ وہ میدانِ جنگ میں پہنچیں تو دیکھا کہ سرورِ عالم ﷺ زخمی ہیں اور چہرہ مبارک اور سرِ اقدس سے خون جاری ہے۔ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ ڈھال میں پانی بھر کر لائے اور حضرت سیدہؓ زخم دھونے لگیں۔ پانی ڈالنے سے خون زیادہ بہنے لگا۔ چنانچہ سیدہؓ نے پانی ڈالنا بند کر دیا۔ چٹائی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے جلایا اور اسے زخم میں بھر دیا۔ اس طرح خون بند ہو گیا۔

اس سلسلہ میں کچھ روایتیں اس قسم کی بھی ملتی ہیں کہ: —

(الف) سیدہ فاطمہؓ حضورؐ کی معیت میں میدانِ جنگ میں تشریف لے گئیں اور وہاں مجاہدین (زخمیوں) کو پانی پلاتی رہیں، اور ان کی مرہم پٹی کرتی رہیں۔
(ب) حضورؐ زخمی ہوئے تو سیدہ فاطمہؓ نے آپؐ کے روئے مبارک کے زخم کو صاف کر کے مرہم پٹی کی۔

(ج) غزوةٴ اُحد کے وقت سیدنا حضرت حسنؓ کی ولادت کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے اور وہ سیدہ فاطمہؓ کی گود میں تھے اس کے باوجود وہ حضورؐ کے زخمی ہونے کی خبر سنتے ہی میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ آپؐ کے زخم دھوے اور مرہم پٹی کی۔

۸۔ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ فتح مکہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت فاطمہؓ بھی آپؐ کے ساتھ مکہ گئیں۔ فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں ان کی موجودگی کا ثبوت اس روایت سے ملتا ہے:

” اُمّ ہانیؓ کہتی ہیں کہ جب مکہ فتح ہو گیا (اور حضورؐ ابھی مکہ ہی میں تھے) کہ (ایک دن) فاطمہؓ آئیں اور رسول اللہ ﷺ کی بائیں جانب بیٹھ گئیں اور میں آپؐ کی دائیں جانب تھی۔ پس ایک لونڈی ایک برتن لے کر حاضر ہوئی جس میں پینے کی کوئی چیز تھی۔ لونڈی نے وہ برتن آپؐ کو دے دیا۔ آپؐ نے تھوڑا سا پی لیا اور پھر مجھے دے دیا۔ میں نے اس کو پی لیا اور پھر عرض کیا، یا رسول اللہؐ میں روزہ سے تھی اور میں نے پی لیا، آپؐ نے پوچھا، کیا تم نے کوئی قضا روزہ رکھا تھا؟ میں نے کہا نہیں، آپؐ نے فرمایا، اگر یہ روزہ نفل تھا تو کچھ حرج نہیں۔

(مشکوٰۃ شریف بحوالہ مسند ابی داؤد، مسند دارمی، ترمذی)

ذیقعدہ ۱۰ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ حجۃ الوداع کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو سیدہ فاطمہ الزہراءؑ بھی آپ کے ہمراہ تھیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اس زمانے میں نجران (یمن) گئے ہوئے تھے۔ مکہ پہنچ کر حضرت فاطمہؑ نے رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ عمرہ ادا کیا اور آپ کے حکم سے احرام کھوالا۔ اسی وقت حضرت علیؑ نجران سے مکہ معظمہ پہنچے۔ انہوں نے حضرت فاطمہؑ سے احرام کھولنے کا سبب پوچھا۔ سیدہؑ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے۔

سرورِ عالم ﷺ نے گیہوں کی پیداوار سے (جو خیبر، فدک وغیرہ کی زمینوں سے حاصل ہوتی تھی) حضرت فاطمہؑ کا خاص حصہ مقرر فرمایا تھا۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ حضورؐ نے ایک تحریری فرمان کے ذریعہ حضرت فاطمہؑ کا حصہ پچاسی وسق گندم مقرر فرمایا تھا۔ اس فرمان پر حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت عباسؓ کی گواہی تھی۔ اس میں ازواجِ مطہراتؓ، حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ (حبُّ النبیؐ) حضرت مقدادؓ بن الاسود اور اُمّ رمیثہؓ کے حصے بھی مقرر کیے گئے تھے۔

حضرت زیدؓ بن ارقم سے روایت ہے کہ بعض صحابہؓ کے گھروں کے دروازے مسجدِ نبویؐ میں کھلتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر حکم دیا کہ فاطمہؑ کے گھر کے سوا ایسے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ صرف حضرت فاطمہؑ کے گھر کا دروازہ باقی رکھا گیا۔

ایک مرتبہ حضرت علیؑ نے رسولِ اکرمؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ، آپ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا فاطمہؑ سے؟ حضورؐ نے فرمایا، فاطمہؑ مجھے تم سے زیادہ محبوب ہے اور تم مجھے فاطمہؑ سے زیادہ عزیز ہو۔



اعزہ واقربا کی محبت

اسلام میں صلہ رحمی کی بہت تاکید کی گئی ہے اور خویش و اقارب سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ ایک سچی مومنہ تھیں اس لیے وہ اپنے تمام اعزہ واقربا سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان سے حسن سلوک اور احسان و مروت سے پیش آتی تھیں۔ اپنی خوشدامن حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کو حقیقی ماں کی طرح جانتی تھیں اور دل و جان سے ان کی خدمت کرتی تھیں خود حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کا بیان ہے:

”جس قدر میری خدمت فاطمہؓ نے کی ہے شاید ہی کسی بہو نے اپنی ساس کی اتنی خدمت کی ہو۔“

حضرت فاطمہؓ کی بہن سیدہ رقیہؓ نے ۲ ہجری میں وفات پائی تو سرورِ عالم ﷺ غزوہ بدر کے سلسلہ میں مدینہ منورہ سے باہر تھے۔ آپؐ واپس تشریف لائے تو حضرت رقیہؓ کی قبر پر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر سیدہ فاطمہؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھیں وہ قبر کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ سرورِ عالم ﷺ کپڑے سے ان کے آنسو پونچھتے جاتے تھے اور تسلی دینے جاتے تھے۔

سیدہ فاطمہؓ کے چچا حضرت جعفرؓ بن ابی طالب (حضرت علیؓ کے حقیقی اور حضورؐ کے چچا زاد بھائی) نے غزوہ موتہ میں شہادت پائی تو ان کو شدید صدمہ ہوا۔

ان کی شہادت کی خبر سن کر وہ ”واعماہ واعماہ“ (ہائے میرے چچا ہائے میرے چچا) کہہ کر روتی ہوئی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے باپشتم پر نم فرمایا: ”بے شک جعفر جیسے شخص پر رونے والیوں کو رونا چاہیے۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے حضرت فاطمہؑ سے فرمایا: ”دیکھو بیٹی زبان سے کچھ نہ کہنا اور نہ سینہ کو بوی کرنا۔“ اس کے بعد حضورؐ نے اپنی لختِ جگر سے فرمایا:

”فاطمہ! جعفر کے بچوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ اسماء (بنتِ عمیس زوجہ حضرت جعفرؑ) آج سخت غمزدہ ہے۔“

صحیح بخاری میں ہے کہ ذیقعدہ کے ہجری میں حضورؐ عمرۃ القضا کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ صلح نامہ حدیبیہ کی شرط کے مطابق تین دن کے قیام کے بعد آپؐ مکہ سے چلنے لگے تو آپؐ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؑ (شہیدِ احد) کی کسن صاحبزادی اُمَامَہؑ ”یا عم یا عم (اے چچا اے چچا) کہتی ہوئی حضورؐ کی طرف دوڑیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس وقت وہ یا انخی یا انخی یعنی اے بھائی اے بھائی کہہ رہی تھیں۔ (فی الحقیقت حضرت حمزہؑ حضورؐ کے رضاعی اور خالہ زاد بھائی بھی تھے اور چچا بھی۔ اس لیے آپؐ اُمَامَہؑ کے چچا بھی ہوتے تھے اور بھائی بھی)

اس موقع پر حضرت علیؑ حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے اُمَامَہؑ کو گود میں اٹھا لیا اور اپنے ساتھ لا کر فاطمہ الزہراءؑ کے سپرد کر دیا کہ یہ تمہاری بنتِ عم ہے۔ سیدہ فاطمہؑ نے ان کو بڑے لطف و محبت کے ساتھ اپنے پاس رکھ لیا لیکن بعد میں انہوں نے حضورؐ کے حکم کے مطابق اُمَامَہؑ کو حضرت جعفرؑ کے سپرد کر دیا کیونکہ ان کی زوجہ اسماء بنتِ عمیس اُمَامَہؑ کی حقیقی خالہ تھیں (حضرت اُمَامَہؑ کی والدہ کا نام سلمیٰ بنتِ عمیس تھا)

غرض حضرت فاطمہؑ الزہراء کے تمام اعزہ و اقربا سے نہایت اچھے تعلقات تھے وہ ان سب کے ساتھ محبت اور خندہ پیشانی سے پیش آتی تھیں اور ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھیں۔ وہ سب بھی سیدہ کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور ان سے بڑی محبت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔



سوتیلی ماؤں سے تعلق

حضرت فاطمۃ الزہراءؑ کی والدہ ماجدہ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کا مکہ معظمہ میں ہی انتقال ہو چکا تھا (۱۰۔ نبوت)

حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کے بعد حضرت سوڈہ بنت زَمْعہ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ حضورؐ کے عقد میں آئیں۔ اپنی شادی سے پہلے سیدہ فاطمہؑ ان دونوں ماؤں کے ساتھ بڑے پیار اور محبت سے رہیں۔ آگے چل کر سرورِ عالم ﷺ نے اور کئی عقد کیے۔ اس وقت سیدہ فاطمہؑ کی شادی ہو چکی تھی تاہم ان کے تمام سوتیلی ماؤں سے نہایت اچھے تعلقات تھے۔ سبھی ماؤں کے نزدیک ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور سبھی ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ خصوصاً اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ان سے خاص تعلق خاطر تھا۔ حضرت فاطمہ الزہراءؑ کے متعدد فضائل و مناقب حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی سے مروی ہیں۔

سیدہ فاطمہؑ کی شادی ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس کے اہتمام میں خاص حصہ لیا۔ وہ خود بیان فرماتی ہیں۔

”عقد کے بعد فاطمہؑ کے لیے ایک مکان تجویز کیا گیا۔ ہم نے بطحے کے کنارے سے نرم مٹی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اس میں بچھائی، فرش تیار کیا، لپائی کی، پھر کھجور کی چھال اپنے ہاتھوں سے تو م کر دو تکیے تیار کیے، چھوہارے اور منقے دعوت میں پیش کیے۔ لکڑی کی ایک

انگنی تیار کی تاکہ اس پر پانی کی مشک اور کپڑے لٹکائے جائیں۔
 فاطمہؓ کے بیاہ سے کوئی اچھا بیاہ میں نے نہیں دیکھا (ابن ماجہ)
 شادی کے بعد حضرت فاطمہؓ جس مکان میں گئیں اس میں اور حضرت عائشہؓ
 کے حجرے میں صرف ایک دیوار کا فصل تھا۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس
 سے کبھی کبھی باہم بات چیت ہو جاتی تھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدہ فاطمہؓ لونڈی کی درخواست کے لیے
 رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں آئیں لیکن اتفاق سے باریابی نہ ہوئی تو وہ حضرت
 عائشہ صدیقہؓ ہی کو وکیل بنا کر واپس چلی گئیں۔

ایک مرتبہ ایک تابعی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا:
 ”اے ہماری ماں یہ تو بتائیے رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب
 کون تھا؟“

فرمایا: ”فاطمہ“

اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت
 عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمہؓ الزہراءؓ کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور دونوں
 میں بڑی محبت اور میل ملاپ تھا۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ان دونوں
 کے دل باہم صاف نہیں تھے۔ ان کے اس ادعاء کی تائید میں کوئی ایک بھی مستند
 اور صحیح حدیث موجود نہیں ہے۔



نواسوں اور نواسیوں سے حضورؐ کی محبت

سرورِ عالم ﷺ اپنے نواسوں اور نواسیوں سے بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ سیدہ زینبؓ کی صاحبزادی اُمّہ اور فرزند علیؑ سے آپ کو جس قدر پیار تھا اس کا حال حضرت زینبؓ کے سوانح حیات میں آچکا ہے۔ اسی طرح سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ کے بچوں سے بھی آپ کو قلبی لگاؤ تھا۔ سیدنا حضرت حسنؑ پیدا ہوئے تو حضورؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ نومولود کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور اس کے کان میں اذان دی اس کے بعد اسے اپنا لعابِ دہن چٹایا۔ حضرت علیؑ نے ان کا نام حرب رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا، نہیں اس کا نام حسن رکھو۔ آپ نے حضرت حسنؑ کے بارے میں فرمایا:

”میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے۔“

ایک اور موقع پر فرمایا:

”یہ جنت میں میرا خوشبودار پھول ہے۔“

سیدنا حضرت حسینؑ کی ولادت پر بھی حضورؐ سیدہ فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے کانوں میں اذان دی۔ ان کا نام بھی حرب تجویز کیا گیا تھا لیکن حضورؐ نے حسینؑ رکھا۔

بارگاہِ رسالت میں حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ آپ فرماتے تھے:

”حسن اور حسینؑ میرے بیٹے، میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ اے اللہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان کو اپنا محبوب بنا اور جو ان سے محبت کرے تو بھی اس سے محبت کر۔“

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

”حسن اور حسین جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔“

حضورؐ حسینؑ کو کبھی گود میں لے کر اور کبھی دوش مبارک پر بٹھا کر باہر نکلتے۔ ان کی معمولی سی تکلیف پر بھی مضطرب ہو جاتے اور ان کو دیکھنے کے لیے روزانہ حضرت فاطمہؑ کے کھر قدم رنجہ فرماتے۔ دونوں بچے نماز کی حالت میں کبھی حضورؐ کی پشت مبارک پر بیٹھ جاتے، کبھی رکوع کی حالت میں دونوں ٹانگوں کے بیچ میں گھس جاتے، کبھی ریش مبارک سے کھیلتے حضورؐ ان کو کبھی نہ جھڑکتے اور ہنس دیتے۔

ایک دن حضورؐ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے کہ حسینؑ اتفاق سے وہاں آ گئے۔ دونوں بہت کسن تھے اور لڑکھڑا کر چل رہے تھے۔ حضورؐ نے انہیں دیکھا تو منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور دونوں کو گود میں اٹھالیا پھر اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا:

”اللہ نے سچ کہا ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد آزمائش (فتنہ) ہی تو ہیں۔ میں نے ان دونوں بچوں کو دیکھا کہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے ہیں تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے میں نے انہیں اٹھالیا۔“

ایک دفعہ حضرت حسنؑ (بروایت دیگر حضرت حسینؑ) حضورؐ کے قدم مبارک پر اپنا قدم رکھ کر کھڑے تھے۔ آپؐ نے ان کے قدم اپنے سینہ مبارک پر رکھ لیے اور منہ چوم کر فرمایا:

”خدا یا میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی رکھ۔“

حضورؐ سیدہ فاطمہؑ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے، میرے بچوں کو لاؤ۔

وہ لاتیں تو آپ ان کو سینہ سے لپٹاتے اور ان کا منہ چومتے۔
 ایک دن حضورؐ کسی دعوت میں شریک ہونے کے لیے گھر سے نکلے۔ حسینؑ گلی
 میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حضورؐ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلائے ننھے
 حسینؑ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ آپؐ بھی ہنستے ہنستے ان کے پیچھے ہو لیے۔ یہاں
 تک کہ انہیں پکڑ لیا، پھر آپؐ نے ان کا ہاتھ اپنی گڈی کے نیچے اور دوسرا ٹھوڑی
 کے نیچے رکھ لیا اور فرمایا:

”حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں اللہ اس شخص سے محبت
 کرے جس نے حسینؑ سے محبت کی۔“

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں:

”میری ان دونوں آنکھوں نے دیکھا ہے اور ان دو کانوں نے سنا ہے
 کہ رسول اللہ ﷺ حسینؑ کے دونوں کندھے پکڑے ہوئے تھے۔ ان
 کے پاؤں رسول اللہ ﷺ کے پاؤں پر تھے، آپؐ فرما رہے تھے ترق
 ترق عین بقہ (اے ننھے منے! اٹھ) یہ کہہ کر آپؐ نے حسینؑ کو
 اپنے ہاتھوں میں اٹھایا یہاں تک کہ ان کے پاؤں آپؐ کے سینہ پر
 لگنے لگے۔ آپؐ نے ان سے کہا، ”منہ کھولو“ انہوں نے منہ کھول دیا۔
 آپؐ نے انہیں پیار کیا اور فرمایا: اے اللہ میں اس سے محبت کرتا ہوں
 تو بھی اس سے محبت کر۔“

(طبری)

حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کسی ضرورت سے رسول
 اللہ ﷺ کے گھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ کوئی چیز چادر میں لپیٹے ہوئے باہر تشریف
 لائے۔ جب میں اپنی ضرورت بیان کر چکا تو آپؐ سے دریافت کیا:
 ”یا رسول اللہ یہ آپؐ کیا لپیٹے ہوئے ہیں؟“

آپؐ نے بے اٹھایا تو اس میں سے حسنؑ اور حسینؑ ظاہر ہوئے جو آپؐ کی گود میں چڑھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

”یہ دونوں میرے بیٹے، میری بیٹی کے لختِ جگر ہیں۔ اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرنا ہوں، تو بھی ان دونوں سے اور ہر اس شخص سے جو ان سے محبت کرتا ہے محبت کر۔“ (ترمذی)

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ ایک دن میرے سامنے رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؑ سے فرمایا، میرے بیٹوں کو میرے پاس لاؤ جب وہ دونوں (حسنؑ اور حسینؑ) آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے انہیں سینے سے چمٹا لیا۔ (ترمذی)

سیدہ فاطمہؑ کے بچوں سے حضورؐ کی محبت اور شفقت کے اور بھی بہت سے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔



ابوسفیانؓ کی بارگاہِ سیدہؓ میں حاضری

۸ ہجری میں حضورؐ کے مکہ پر لشکر کشی کرنے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریشِ مکہ کے حلیف قبیلہ بنو بکر نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر بلا وجہ حملہ کیا تھا اور ان کے بہت سے افراد کو قتل کر ڈالا تھا۔ یہاں تک کہ حرمِ کعبہ میں پناہ لینے والوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس ظالمانہ کام میں خود مشرکینِ مکہ نے بنو بکر کی مدد کی تھی۔ یہ بات صلح نامہ حدیبیہ کی صریح خلاف ورزی تھی۔ حضورؐ نے ایک قاصد بھیج کر اہل مکہ سے اس قتل و غارت کا سبب پوچھا، تو ان کے بعض نوجوانوں نے نہایت گستاخانہ جواب دیا اور قاصد کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ہم نہیں جانتے محمدؐ کون ہے۔

جب حضورؐ کا قاصد واپس آ گیا تو مشرکین کے بڑے بوڑھوں اور سربر آوردہ آدمیوں نے محسوس کیا کہ ہم سے سخت غلطی ہوئی ہے اور جو کچھ ہم نے کیا ہے ہمیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ انہوں نے ابوسفیانؓ کو (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) اس غرض سے مدینہ منورہ بھیجا کہ وہ جا کر مسلمانوں سے دوبارہ معاہدہ صلح کی کوشش کریں تاکہ قریش کو کسی مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ابوسفیانؓ نے مدینہ پہنچ کر پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات کی اور ان سے مدد کی درخواست کی لیکن ان دونوں بزرگوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ابوسفیانؓ، حضرت فاطمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے التجا کی کہ وہ

اپنے اثر سے کام لے کر قریش مکہ کو رسول اللہ ﷺ سے معافی دلا دیں اور حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو حکم دیں کہ وہ لوگوں میں اعلان کر دیں کہ ہم نے اہل مکہ کو امن دے دیا ہے۔ سیدہ فاطمہؑ الٰہیہ اپنے والد گرامیؑ کی مزاج شناس تھیں۔ انہوں نے اس معاملے میں دخل دینے سے بالکل انکار کر دیا اور فرمایا:

”رسول اللہ ﷺ کی مرضی اور ایماء کے بغیر ہم میں سے کوئی شخص نہ کسی کو امن دے سکتا ہے اور نہ کسی سے صلح کر سکتا ہے۔“

اس پر ابوسفیانؑ مایوس ہو گئے اور یک طرفہ تجدید صلح کا اعلان کر کے واپس چلے گئے۔



سیدالانام نے فاطمہ بنت محمد کی مثال دی

فتح مکہ کے موقع پر بنو مخزوم کی ایک عورت فاطمہ نامی سے چوری کی لغزش سرزد ہوگئی اور وہ پکڑی گئی۔ سرورِ عالم ﷺ نے اس پر شریعت کے مطابق حد جاری کرنے (یعنی اس کا ہاتھ کاٹنے) کا حکم دیا۔ اس کے اقرباء اور اہل قبیلہ نے جبؓ النبیؐ حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ کو حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں بھیجا کہ وہ اس عورت کی سفارش کریں۔ حضرت اُسامہؓ نے حضورؐ سے اس عورت کی خطا بخشنے کی درخواست کی تو آپؐ کو ان کی سفارش ناگوار گزری اور آپؐ نے حضرت اُسامہؓ سے فرمایا:

”کیا تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے بارے میں (رعایت کی) گفتگو کرتے ہو؟“

حضورؐ کا ارشاد سن کر حضرت اُسامہؓ کانپ اٹھے اور عرض کیا:

”یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، میرے لیے مغفرت طلب فرمائیے۔“

شام ہوئی تو حضورؐ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

”اما بعد پہلے لوگ (بروایتِ دیگر بنو اسرائیل) اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں کوئی شریف (معزز یا امیر) آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان میں کوئی کمزور (معمولی) آدمی چوری

کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہؑ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اس کے بعد فاطمہؑ محزونہ پر حد جاری کی گئی۔ ہاتھ کٹنے کے بعد ان کی زندگی میں یکسر انقلاب آ گیا۔ انہوں نے توبہ کی اور اس کو نہایت پرہیزگاری اور استقامت کے ساتھ نباہا۔

اس واقعہ میں حضورؐ نے حضرت فاطمہؑ بنت محمدؐ کی جو مثال دی اس سے آپؐ لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ فاطمہؑ جو میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور مجھ کو بے حد محبوب ہے، حدود اللہ کے معاملے میں اس کی رعایت بھی مجھے منظور نہیں ہے۔



واقعہء مباہلہ

رحمت عالم نے جب اپنے وطن اور گھر بار کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو گلشنِ اسلام میں بہارِ تازہ آگئی۔ چند سال پہلے وادیء بطحا سے جو صدائے حق بلند ہوئی تھی وہ اب روز بروز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ یمن و بحرین اور حضرموت سے حدودِ شام تک پھیلے ہوئے لاکھوں مربع میل علاقے میں گھر گھر تک پہنچ گئی۔ معبودانِ باطل کے پجاریوں نے جب دیکھا کہ شمعِ رسالت کے پروانوں کی تعداد میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو ان پر ہیبتِ حق طاری ہوگئی اور وہ دنیائے عرب کے کونے کونے سے اپنے علاقوں اور قبیلوں کے نمائندہ وفد بنا کر جوق در جوق بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے لگے کچھ اسلام قبول کرنے کے لیے، کچھ دعوتِ اسلام قبول کرنے کے بعد احکام دین سکھنے اور حضور کی زیارت و بیعت کا ثرف حاصل کرنے کے لیے اور کچھ صلح و امن کا معاہدہ کرنے کے لیے۔ وفود (سزارتوں) کا یہ سلسلہ ۵ ہجری میں شروع ہوا اور وصالِ نبوی سے چار ماہ قبل تک جاری رہا۔ فتحِ مکہ (۸ ہجری) کے اگلے سال تو اس کثرت سے وفود آئے کہ ۹ ہجری کا نام ہی سالِ الوفود پڑ گیا۔ ان تمام وفود کی تعداد کے بارے میں اہلِ سیر میں اختلاف ہے۔ انہوں نے پندرہ سے لے کر ایک سو چار وفود تک کا حال لکھا ہے۔ ان میں سے، وفدِ نجران کا ذکر تمام اہلِ سیر نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے کیونکہ اسی وفد سے گفتگو یا بحث کے دو ان میں

مباہلہ کا واقعہ پیش آیا تھا۔

نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو سارے عرب میں عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز تھی (بعض مؤرخین کے مطابق یہ ریاست حدودِ یمن میں واقع تھی۔ اس ریاست کا یمن کی حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ یہ براہِ راست قیصرِ روم کے ماتحت تھی) نجران کا علاقہ نہایت سرسبز اور شاداب تھا اور اس کے باشندے جو عیسائی عرب تھے، صنعت و حرفت اور تجارت کی بدولت بڑے خوشحال تھے۔ یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان گرجا تھا۔ کعبہء نجران کے نام سے مشہور تھا۔ ریاست کا نظم و نسق تین شعبوں میں منقسم تھا۔ ہر شعبے کا اعلیٰ عہدے دار الگ تھا۔ دینی معاملات کا افسرِ اعلیٰ ”اسقف“ کہلاتا تھا۔ خارجی اور جنگی امور کا نگران سید اور داخلی امور کا نگران ”عاقب“ کہلاتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان لوگوں کو ایک نامہ مبارک بھیجا جس میں انہیں دعوتِ اسلام دی گئی تھی۔ ان لوگوں نے اسلام تو قبول نہیں کیا البتہ ساٹھ آدمیوں کا ایک وفد ۹ ہجری میں تحقیقِ احوال کے لیے مدینہ منورہ بھیجا۔ اس وفد میں اسقف، سید اور عاقب سمیت نجران کے بڑے بڑے معززین اور شرفاء شامل تھے۔ ان لوگوں نے لیے مسجدِ نبوی کے صحن میں خیمے لگا دیئے گئے اور انہوں نے وہیں قیام کیا۔ یہ لوگ غالباً اتوار کے دن مدینہ منورہ پہنچے تھے جو ان کا یومِ عبادت تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے طریقے پر مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنی چاہی تو صحابہؓ نے اعتراض کیا — حضورؐ نے فرمایا: — ”پڑھنے دو“۔

اجازت ملنے پر انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے اپنی نماز پڑھی۔ ان لوگوں نے خاصی مدت مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ اس دوران میں حضورؐ ان کو برابر حق کی طرف بلاتے رہے اور ان کے طرح طرح کے سوالوں کے جواب وحی کی رو

۱۔ ایک دوسری روایت کے مطابق وفدِ نجران ۱۰ھ میں مدینہ منورہ آیا۔

سے دیتے رہے لیکن ان لوگوں کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی۔۔۔ ”میں نہ مانوں“۔
 مفسرین نے لکھا ہے کہ سورہ آل عمران کی ابتدائی اسی (۸۰) آیات وفدِ
 نجران کے قیام کے دوران ہی میں نازل ہوئیں۔ ایک دن حضورؐ نے انہیں اسلام
 کی دعوت دی تو کہنے لگے کہ ہم تو پہلے ہی سے مسلمان ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم
 لوگ صلیب کے پجاری ہو اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو حالانکہ ان کی
 حالت اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم جیسی تھی اور وہ بھی ان کی طرح مٹی سے پیدا کیے
 گئے تھے پھر وہ خدا کس طرح ہو گئے۔ اہل وفد نے ہادیء برحقؑ کی کوئی بات نہ مانی
 اور برابر کٹختیاں کرتے رہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا
 نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ۗ

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ ۝ (آل عمران: ۶۷)
 (اور جو کوئی تم سے علم آئے پیچھے بھی جھگڑا کرتا ہے اس سے کہہ دو کہ آؤ
 ہم اپنے بچوں، مردوں اور عورتوں کو بلا لیتے ہیں تم اپنے بچوں،
 مردوں اور عورتوں کو بلا لو پھر ان کے ساتھ ہم اور تم اللہ سے دعا کریں
 کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو)

چنانچہ اتمامِ حجت کے طور پر حضورؐ حضرت فاطمہ الزہراءؑ، حضرت حسنؑ اور
 حضرت حسینؑ کو ساتھ لے کر عیسائیوں سے مباہلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ بعض
 روایات کے مطابق اس موقع پر حضورؐ نے حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کو بھی اپنے
 ساتھ لیا تھا۔ آپ کے پیچھے سیدہ فاطمہ الزہراءؑ تھیں اور ان کے پیچھے حضرت علیؑ کرم
 اللہ وجہہ، حضورؐ نے ان چاروں کو ہدایت فرمادی تھی کہ میں دعا کروں تو تم سب
 آمین کہنا۔ اس وقت ان نفوسِ قدسی کے چہروں سے حق کا ایسا رعب اور جلال
 ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کو دیکھتے ہی وفد کے ارکان کانپ اٹھے اور ان کے سرداروں

نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر یہ واقعی نبی ہیں تو ہم مباہلہ کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد و ملعون ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ ہم نہ مباہلہ کرتے ہیں اور نہ اسلام قبول کرتے ہیں البتہ ہمیں جزیہ دینا منظور ہے۔ آپ ہمارے ساتھ ایک دیانت دار آدمی کو بھیج دیں جس کو ہم خراج کی رقم جو آپ مقرر کریں گے ادا کر دیا کریں گے۔ حضورؐ نے ان کی بات مان لی اور فریقین کے مابین اسی کے مطابق معاہدہ صلح پا گیا۔ جب یہ وفد رخصت ہونے لگا تو حضورؐ نے حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو خراج کی وصولی کے لیے اس کے ساتھ بھیج دیا اور فرمایا: ”یہ ہماری امت کے امین ہیں“۔

بعض روایتوں میں ہے کہ نجران سے یکے بعد دیگرے دو وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ پہلا وفد تین آدمیوں پر مشتمل تھا اور اسی وفد کے ساتھ بحث کے دوران میں آیاتِ مباہلہ نازل ہوئی تھیں۔ ان لوگوں نے مباہلہ نہ کیا اور جزیہ دینا قبول کر کے واپس چلے گئے۔ اس وفد کے بعد دوسرا وفد جو ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا، مدینہ منورہ آیا اور وہ بھی حضورؐ سے فرمانِ امن لے کر واپس گیا۔

سرورِ کونین کا وصال

۱۔ ہجری میں حضور سرورِ کونین کو خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ حضور علیہ السلام ہونے، جب علالت زیادہ بڑھ گئی تو ایک دن فاطمہ الزہراءؑ کی خبر گیری کے لیے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرے میں تشریف لائیں۔ حضور نے انہیں دیکھ کر فرمایا۔ مرحبا یا بنتی۔ (اے میری بیٹی خوش رہو) پھر نہایت شفقت سے انہیں اپنے پاس بٹھالیا اور ان کے کان میں آہستہ سے کوئی بات کہی جسے سن کر وہ رونے لگیں پھر حضور نے کوئی اور بات ان کے کان میں فرمائی جسے سن کر وہ ہنسنے لگیں تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان سے پوچھا۔ ”اے فاطمہ تمہارے ابا جان نے تم سے چپکے سے کیا کہا؟“ (یا بروایت دیگر اے فاطمہ تیرے رونے اور ہنسنے میں کیا بہید تھا؟“

سیدہ نے جواب دیا، ”جو بات حضور نے اخفا میں رکھی ہے میں اسے ظاہر نہ کروں گی۔“

سرورِ کونین کے وصال کے بعد ایک دن حضرت عائشہ صدیقہؓ (اور بعض روایتوں کے مطابق حضرت اُمّ سلمہؓ) نے اصہار کے ساتھ سیدہ فاطمہ الزہراءؑ سے اس دن کے واقعہ کی تفصیل پوچھی تو سیدہ نے فرمایا، ”پہلی دفعہ حضور نے فرمایا تھا کہ پہلے جبریل امینؑ سال بٹاں ہمیشہ ایک بار قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے۔ اس

۱۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضور نے سیدہ فاطمہ کو بلا بھیجا تھا۔

سال خلاف معمول دو بار کیا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میری وفات کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ یہ سن کر میں رونے لگی۔ پھر حضورؐ نے فرمایا تھا، تم میرے گھر والوں میں سب سے پہلے مجھے ملو گی اور تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو گی، اس بات سے مجھے خوشی ہوئی اور میں ہنسنے لگی۔“

ایامِ علالت میں ایک دن (اور بعض روایتوں کے مطابق اپنی وفات کے دن) سرورِ عالم ﷺ نے سیدہ فاطمہؓ سے فرمایا کہ اپنے بچوں کو بلا لاؤ۔ وہ سب بچوں (حضرت حسنؓ، حسینؓ، ام کلثومؓ اور زینبؓ) کو حضورؐ کے پاس لے گئیں۔ اپنے شفیق نانا کی بے چینی دیکھ کر سب بچے رونے لگے۔ حضورؐ نے ان سب کو پوچھا، ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور دلاسا دیا۔

رحلت سے قبل جب حضورؐ پر بار بار غشی طاری ہونے لگی تو سیدہ فاطمہ الزہراءؓ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ان سے حضورؐ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا اور زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے — وا کربُ اباہ (ہائے میرے باپ کی بے چینی) حضورؐ نے فرمایا ”تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا۔“

ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ کے وصال سے پہلے سیدہ فاطمہ الزہراءؓ آپ کے قریب بیٹھ کر رونے لگیں۔ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا:

”جانِ پدر، روؤ نہیں، تمہارے رونے سے عرشِ الہی بھی رورہا ہے۔“

پھر آپ نے اپنے دستِ مبارک سے سیدہ کے آنسو پونچھے اور انہیں تسلی و تشفی دی۔

جس وقت سرورِ کونین کی روح پاک عالمِ قدس میں پہنچی تو سیدہ فاطمہ الزہراءؓ پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور شدتِ الم میں ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

پیارے ابا جان آپ نے اللہ کے بلاوے کو قبول کر لیا۔
 پیارے ابا جان آپ فردوسِ بریں کو سدھار گئے۔
 ہائے ابا جان جبرئیلؑ کو آپ کی رحلت کی خبر کون پہنچائے گا۔
 ہائے ابا جان، آپ کے بعد اب وحی کس پر اترے گی اور جبرئیل کس
 کے پاس آئیں گے۔

پھر انہوں نے دعا مانگی — ”اے اللہ فاطمہ کی روح کو محمدؐ کی روح کے پاس
 پہنچا دے۔ الہی مجھے رسول اللہ ﷺ کے دیدار سے مسرور کر دے۔ الہی مجھے یہ
 صدمہ برداشت کرنے کی طاقت دے۔ الہی حشر کے دن مجھے رسول اللہ ﷺ کی
 شفاعت نصیب فرما۔“

سرورِ کونین کی تجہیز و تکفین کے بعد صحابہء کرامؓ تعزیت کے لیے سیدہ فاطمہ
 زہراؑ کے پاس آتے تھے لیکن انہیں کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ایک دن حضور پر نورؐ کے
 خادمِ خاص حضرت انسؓ بن مالک تعزیت و تسلی کے لیے حضرت سیدۃ النساءؑ کی
 خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیدہؑ نے ان سے فرمایا ”انسؓ یہ تو بتاؤ تمہارے دل نے
 یہ کیسے گوارا کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا جسدِ اقدس زمین کے سپرد کرو؟“
 یہ سن کر حضرت انسؓ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور غم و الم کا پیکر بنے
 ہوئے واپس گئے۔

تمام اہل سیر متفق ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد کسی نے سیدہ
 فاطمہ الزہراؑ کو ہنتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک دن سیدہ فاطمہؑ سرورِ عالم ﷺ کی قبر مبارک پر گئیں اور اشکبار ہو کر یہ
 اشعار پڑھنے لگیں:

مَاذَا عَلَى مَنْ شَمَّ تُرْبَةَ أَحَبِّدَ أَنْ لَا يَشُمَّ مَدَى الزَّمَانِ غَوَالِيَا
 صَبَّتْ عَلَى مَصَائِبٍ لَوْ أَنَّهَا صَبَّتْ عَلَى الْأَيَّامِ صَدْرًا لِيَالِيَا

(جو شخص احمد کی تربت کی مٹی یا رسونگھ لے اس پر لازم ہے کہ پھر کبھی کوئی خوشبو نہ سونگھے (یعنی اس کو ساری عمر کسی خوشبو کے سونگھنے کی ضرورت نہیں) مجھ پر جو مصیبتیں پڑیں اگر دنوں پر پڑتیں تو وہ راتوں میں تبدیل ہو جاتے)۔

کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں شعر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہیں۔ سیدۃ النساء حضور کے مرقد اقدس پر حاضر ہوئیں تو خود بخود ان کی زبان پر جاری ہو گئے۔ بعض اہل سیر نے خود سیدۃ النساء سے بھی کچھ اشعار منسوب کیے ہیں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات پر کہے۔ ان میں چند اشعار یہ ہیں:

أَغْبَرَ آفَاقَ السَّمَاءِ وَكُوْرَتْ
شَمْسُ النَّهَارِ وَأَظْلَمَ الْعَصْرَانِ
وَأَدْرَعُ مِنْ بَعْدِ النَّبِيِّ كَيْبَةَ
أَسْفًا عَلَيْهِ كَثِيرَةَ الْأَحْزَانِ
فَلْيَبِكْهُ شَرْقُ الْبِلَادِ وَغَرْبُهَا
وَلْيَبِكْهُ مُضَرَ وَكُلَّ يَمَانِ
يَا خَاتَمَ الرُّسُلِ الْمُبَارِكِ صِنْوَةَ
صَلَّى عَلَيْكَ مُنْزِلُ الْقُرْآنِ

(آسمان غبار آلود ہو گیا، آفتاب لپیٹ دیا گیا، دنیا میں تاریکی ہو گئی۔ نبی کے بعد زمین نہ صرف غمگین ہے بلکہ فرط الم سے شق ہو گئی ہے۔ چاہیے کہ آپ پر مشرق و مغرب کے رہنے والے روئیں اور چاہیے کہ تمام اہل یمن اور قبیلہ مضر کے لوگ آپ کی وفات پر روئیں۔ اے خاتم الرسل! آپ برکت و سعادت کی جوئے فیض ہیں۔ آپ پر تو قرآن نازل کرنے والے نے بھی درود و سلام بھیجا ہے۔

مرثیہ کے یہ دو شعر بھی سیدۃ النساء کی طرف منسوب ہیں:

إِنَّا فَقَدْنَاكَ فَقَدَ الْأَرْضَ وَابْلَهَا
وَوَغَابَ مُذْغِبَتْنَا الْوَحْيُ وَالْكِتَابُ

فَلَيْتَ قَبْلَكَ كَانَ الْمَوْتُ صَادِقًا
لَمَّا يَغِيبُ وَحَالَتْ دُونَكَ الْكِتَابُ

(آپؐ ہم سے کیا جدا ہو گئے کہ زمین اپنی طراوت سے محروم ہو گئی۔
آپؐ کے تشریف لے جانے سے وحی اور خدائی کتابوں کے اترنے کا
سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ کاش آپؐ کی رحلت سے پیشتر اور اس وقت سے
پہلے جب مٹی نے آپؐ کو پوشیدہ کیا ہمیں موت آ جاتی اور ہم مر گئے
ہوتے)



میراثِ رسولؐ کا معاملہ

شمالی حجاز میں خیبر کے قریب مدینہ منورہ سے تقریباً دو روز کے فاصلے پر "فَدَک" نام کا ایک قدیم قصبہ تھا جس پر یہودی قابض تھے۔ وہاں پانی کے چشمے تھے اور اناج اور کھجور کی پیداوار ہوتی تھی۔ اوائلِ ۷ ہجری میں فتحِ خیبر کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے حضرت مُخَيِّصہؓ بن مسعود انصاری کو ایک دستہ فوج کے ساتھ اہلِ فدک کی طرف روانہ کیا کہ ان کو دعوتِ اسلام دیں۔ اہلِ فدک نے اسلام تو قبول نہ کیا لیکن حضورؐ سے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ نصف زمین اور اس کی پیداوار مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔ چنانچہ فدک کی یہ زمین بطورِ فئے حضورؐ کے قبضے میں آ گئی۔ جب تک حضورؐ پر نورِ اس دنیائے فانی میں رونق افروز رہے فدک کی زمین اور باغات کی آمدنی کو آپؐ اپنے اہلِ بیت اور مسافروں کے اخراجات کے لیے صرف فرماتے رہے۔ اسی طرح خیبر کی زمین اور باغات کو آپؐ نے تین حصوں میں تقسیم فرما دیا تھا۔ دو حصوں کی آمدنی عام مسلمانوں کے لیے وقف تھی اور ایک حصے کی آمدنی ازواجِ مطہراتؓ کے سالانہ مصارف کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ اس میں سے بھی جو کچھ بچ جاتا وہ غریب اور نادار مہاجرین کی اعانت پر صرف ہوتا تھا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد ازواجِ مطہراتؓ نے چاہا کہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں بھیجیں اور وراثت کا مطالبہ کریں لیکن اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اُن کو یاد دلایا کہ میں نے

رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ میرا کوئی وارث نہ ہوگا، میرے تمام متروکات صدقہ ہوں گے۔ یہ سن کر سب خاموش ہو گئیں اور اپنا مطالبہ وہیں ختم کر دیا۔

دوسری طرف سیدہ فاطمہ الزہراء اور حضرت عباس بن عبدالمطلب (عم رسول) نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مطالبہ کیا کہ خیبر اور فدک کی جائیداد (رسول اللہ ﷺ کی میراث کے طور پر) ان میں تقسیم کی جائے۔ اس مطالبہ کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

”میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے، ہمارے مال میں وراثت نہیں ہوگی ہم جو کچھ چھوڑیں گے، صدقہ ہوگا۔ البتہ آل محمد اس میں سے نفقہ لے سکتے ہیں۔ خدا کی قسم! سلوک کرنے کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کی قرابت مجھ کو اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔“ (بخاری کتاب المغازی باب حدیث بنی النضیر)

دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

”خدا کی قسم میں رسول اللہ ﷺ کے صدقہ میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا، اس کی جو حالت رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تھی وہی رہے گی اور میں وہی کروں گا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے۔“ (بخاری کتاب المغازی باب غزوة خیبر)

تیسری روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

”میں بالکل وہی کروں گا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے اور اس میں سے کچھ ترک نہ کروں گا کیونکہ مجھے خوف ہے کہ اگر میں نے کسی چیز سے بھی انحراف کیا (کچھ بھی چھوڑا) تو کج ہو جاؤں گا۔“ (بخاری کتاب الجہاد باب فرض الخمس)

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس جائیداد کا وہی انتظام کیا جو رسول

اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں تھا، وہ سال بھر کے لیے اس میں سے اہل بیت کا نفقہ نکالتے تھے، اس کے بعد جو باقی بچتا تھا اس کو خدا کا مال قرار دیتے تھے یعنی مسافروں، غریبوں، مسکینوں اور اہل حاجت پر صرف کرتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا جواب سن کر سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ کا ردِ عمل کیا تھا؟ اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں:

(۱) حضرت فاطمہؓ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ناراض ہوئیں اور آخر وقت تک ان سے گفتگو نہیں کی۔ (صحیح بخاری)

(۲) حضرت فاطمہؓ کو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے جواب سے رنج تو ضرور ہوا اور وہ ناراض بھی ہوئیں لیکن بعد میں راضی ہو گئیں۔ (طبقات ابن سعد)

(۳) حضرت فاطمہؓ بیمار ہوئیں تو حضرت ابو بکر صدیقؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ ان کی مزاج پرسی کی اور فرمایا:

”میں نے تو گھر بار، مال و دولت اور کنبہ و قبیلہ محض اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا اور اے اہل بیت تمہاری رضا کے لیے چھوڑا تھا۔“

اس پر حضرت فاطمہؓ ان سے خوش ہو گئیں اور کوئی غبار دل میں باقی نہ رکھا۔ (البدایہ والنہایہ — حافظ ابن کثیر)

(۴) حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا جواب سن کر فرمایا: ”پھر آپؐ نے رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنا ہے اس کے مطابق عمل کیجیے۔“

(مسند احمد بن حنبل جلد ۱)

(۵) حضرت فاطمہؓ نے صدیق اکبرؓ کا جواب سن کر اپنے حق پر دوبارہ زور دیا تو انہوں نے فرمایا: ”اے خیرۃ النساء، اے خیر الآباء کی لختِ جگر! خدا کی قسم میں نے رسول اللہ ﷺ کی رائے سے ذرا بھی تجاوز نہیں کیا۔ میں نے وہی کچھ کیا جس کا آپؐ نے حکم دیا۔ رسول اللہ ﷺ فدک سے آپ کی

ضروریاتِ زندگی (خوراک) لیا کرتے تھے اور باقی کو مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور مجاہدین کو سواریاں اسی سے مہیا فرماتے تھے۔ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی وہی کچھ کروں گا جس طرح رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔ یہ سن کر حضرت فاطمہؓ راضی ہو گئیں۔“

(شرح نہج البلاغۃ (جلد خامس) علامہ کمال الدین میثم البحرانی)

جمہور علماء اہل سنت و جماعت نے حضرت فاطمہؓ کی ناراضی والی روایت کو محلِ نظر ٹھہرایا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس موضوع پر بخاری کی کئی روایتوں میں سے صرف ایک روایت میں حضرت فاطمہؓ کی ناراضی بیان کی گئی ہے اور یہ راوی کی قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ بات باور نہیں کی جاسکتی — کہ سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ جیسی پاک فطرت ہستی نے رسول اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی سن کر اسے تسلیم نہ کیا بلکہ یہ ارشاد سنانے والے سے ناراض ہو گئیں اور یوں بھی سیدہ فاطمہؓ کی ارفع و اعلیٰ سیرت و کردار پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا کے مال اور جائیداد سے کوئی رغبت نہ تھی ان کو تو جو مقررہ حصہ ملتا تھا اس کو بھی راہِ خدا میں لٹا دیتی تھیں اور خود فقر و فاقہ سے زندگی بسر کرتی تھیں اس لیے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی لا نُورِثُ، مَا تَرَکْنَا صَدَقَةٌ (ہمارا کوئی وارث نہ ہوگا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہوگا) سن کر حضرت ابو بکر صدیقؓ جیسی عظیم المرتبت اور پاک نہاد ہستی سے ناراض ہو گئی ہوں۔ اگر وہ رنجیدہ ہوئیں بھی اور اس کا کسی شکل میں اظہار بھی کیا تو اس کی تاویل یہی کی جاسکتی ہے کہ وہ حضورؐ کے ارشاد کا مطلب کچھ اور سمجھتی تھیں اور حضرت ابو بکر صدیقؓ اس کا جو مفہوم سمجھتے تھے، اس سے ان کو اتفاق نہ ہوگا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی یہ ناراضی بقاضائے بشریت تھی اور عارضی تھی، بعد میں وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے راضی ہو گئیں اور کسی قسم کی رنجش اپنے دل میں باقی نہ رکھی۔

سیدۃ النساء کا سفرِ آخرت

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا سب سے زیادہ صدمہ سیدہ فاطمہ الزہراء کو ہوا۔ وہ ہر وقت غمگین اور دل گرفتہ رہنے لگیں۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ حضور کے وصال کے بعد کسی نے سیدہ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سیدۃ النساء کو بھی خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ پہنچا جس کی وہ اسی دن سے منتظر تھیں، جب حضور نے انہیں بتایا تھا کہ میرے اہل بیت میں سے سب سے پہلے تم مجھے عالمِ آخرت میں ملو گی۔

سیدہ کی تاریخِ وفات کے بارے میں اہل سیر میں سخت اختلاف ہے۔ مختلف روایات کے مطابق سیدہ نے حضور کے وصال کے — ستر دن — دو ماہ — چار ماہ — چھ ماہ — آٹھ ماہ یا اٹھارہ ماہ بعد وفات پائی۔ جمہور ارباب سیر نے چھ ماہ والی روایت کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ سیدۃ النساء نے ۳ رمضان المبارک ۱۱ ہجری (منگل کی رات کو) سفرِ آخرت اختیار کیا۔ محققین علمائے شیعہ کے نزدیک سیدہ نے ۳ جمادی الآخرہ کو وفات پائی — بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ حضور کے وصال کے بعد آپ کی محبوب بیٹی چند ماہ سے زیادہ آپ سے جدا نہ رہیں اور بہت جلد اس دنیائے فانی کو خیر باد کہہ کر جنت الفردوس میں پہنچ گئیں۔ سیدہ کا کس مرض میں انتقال ہوا یا وہ کتنا عرصہ صاحبِ فراش رہیں، اہل سیر نے

اس کی تصریح نہیں کی۔ اس ضمن میں جو روایتیں ملتی ہیں ان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیدہؓ نے اپنی وفات سے پہلے کیا کیا وصیتیں کی تھیں اور یہ کہ انہیں پہلے سے اپنی وفات کا احساس ہو گیا تھا۔ البتہ بعض ارباب سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شدتِ غم سے سیدہؓ کا جسم روز بروز گھلنے لگا یہاں تک کہ وہ سخت نحیف و نزار ہو گئیں اور انتہائی ضعف و نقاہت کے سبب وفات پا گئیں۔

علامہ ابن اثیر نے ”أسد الغابہ“ میں لکھا ہے کہ وفات سے پہلے سیدہ فاطمہؓ نے حضرت اسماء بنت عمیس (مشہور صحابیہ) کو بلا کر فرمایا کہ:

”میرا جنازہ لے جاتے وقت اور تدفین کے وقت پردہ کا پورا لحاظ رکھنا سوائے اپنے اور میرے شوہر کے اور کسی سے میرے غسل میں مدد نہ لینا اور تدفین کے وقت زیادہ ہجوم نہ ہونے دینا“۔

حضرت اسماءؓ نے کہا، ”یا بنتِ رسول اللہ میں نے حبش میں دیکھا ہے کہ جنازے پر درخت کی شاخیں باندھ کر ایک ڈولے کی صورت بنا لیتے ہیں اور اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں“۔ پھر انہوں نے کھجور کی چند شاخیں منگوائیں، انہیں جوڑا اور پھر ان پر کپڑا تان کر سیدہ بتولؓ کو دکھایا۔ انہوں نے اسے پسند کیا اور بعد وفات ان کا جنازہ اسی طریقہ سے اٹھا۔

حافظ ابن عبدالبر نے ”استیعاب“ میں بھی یہی روایت درج کی ہے لیکن علامہ ابن سعد کاتب الواقدی نے ”طبقات“ میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”اصابہ“ میں ایک عجیب روایت بیان کی ہے۔ ابن سعد نے اس کو ”ام سلمیٰ“ سے روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے ”ام رافع“ سے۔ قیاس یہ ہے کہ ام سلمیٰ اور ام رافع ایک ہی شخصیت ہے۔ اصل نام سلمیٰ اور کنیت ام رافع ہے۔ یہ سیدہ فاطمہ

۱۔ حضرت اسماء بنت عمیس اپنے پہلے خاوند حضرت جعفر بن ابی طالب کے ہمراہ ۶ نبوت میں حبش کو ہجرت کر گئی تھیں اور وہاں کئی برس مقیم رہی تھیں۔

زہرا کی کینز تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جس وقت حضرت فاطمہؑ کی وفات ہوئی حضرت علیؑ گھر سے باہر تھے، حضرت فاطمہؑ نے مجھ سے فرمایا کہ میں غسل کروں گی، پانی کا انتظام کرو اور میرے پہننے کے لیے صاف اور عمدہ کپڑے بھی نکال دو۔ میں نے پانی کا انتظام کر دیا اور کپڑے بھی نکال دیئے۔ حضرت فاطمہؑ نے اچھی طرح غسل کیا اور کپڑے پہنے پھر فرمایا میرا بستر کر دو میں لیٹوں گی۔ میں نے بستر بچھا دیا، وہ بستر پر قبلہ کی طرف منہ کر کے لیٹ گئیں اور مجھ سے فرمایا، اب میرا چل چلاؤ ہے، میں غسل کر چکی ہوں اب دوبارہ غسل کی ضرورت نہیں اور نہ اب میرا بدن کھولا جائے۔ یہ فرما کر انہوں نے وفات پائی۔ جب حضرت علیؑ گھر آئے تو میں نے یہ واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے اسی غسل پر اکتفا کیا اور ان کو دفن کر دیا۔

ابن جوزی اور بعض دوسرے علماء نے اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سیدہ فاطمہؑ کو حضرت اسماء بنت عمیس (زوجہ حضرت ابو بکر صدیقؓ) حضرت سلمیٰ، ام رافع اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تدفین سے پہلے شریعت کے مطابق غسل دیا۔

جمہور علمائے شیعہ کے نزدیک سیدہ فاطمہؑ کی وصیت کے مطابق ان کی میت کو صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے غسل دیا، خود ہی نماز جنازہ پڑھائی اور ایک خاص تابوت میں ان کا جنازہ اٹھایا جو حضرت ام ایمنؑ نے سیدہ فاطمہؑ کی وفات سے پہلے بنا کر ان کو دکھایا تھا۔ پھر انہیں رات ہی کو دفن کر دیا گیا۔

سیدہ فاطمہؑ الزہراؑ کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی؟ امام بخاریؒ اور کچھ دوسرے محدثین اور ارباب سیر نے لکھا ہے کہ سیدہؑ کی نماز جنازہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پڑھائی۔ ایک روایت میں حضرت عباس بن عبدالمطلب اور ایک میں خلیفۃ الرسول حضرت ابو بکر صدیقؓ کا نام بھی لیا گیا ہے۔

”کنز العمال“ میں حضرت (امام) جعفر صادقؑ اپنے والد حضرت (امام) محمد

باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ:

”حضرت فاطمہ دختر رسول اللہ ﷺ فوت ہوئیں تو ابو بکرؓ و عمرؓ دونوں نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے تشریف لائے۔ ابو بکرؓ نے علی المرتضیٰ کو جنازہ پڑھانے کے لیے کہا کہ آگے تشریف لائیے تو علی المرتضیٰ نے جواب دیا کہ آپ خلیفہ رسول ہیں میں آپ سے پیش قدمی نہیں کر سکتا۔ پس ابو بکرؓ نے مقدم ہو کر نمازِ جنازہ پڑھائی۔

(کنز العمال جلد ۶ ص ۳۱۸ طبع قدیم)

علامہ محبت طبری نے ”ریاض النضرۃ“ میں حضرت علی (زین العابدینؑ) بن

حسینؑ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

”حضرت علیؑ نے نمازِ جنازہ کے لیے ابو بکرؓ سے کہا کہ آگے تشریف لائیے۔ ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ اے ابوالحسن! آپ کی موجودگی میں؟ انہوں نے کہا، ہاں، آپ آگے تشریف لائیے۔ خدا کی قسم آپ کے بغیر کوئی دوسرا شخص فاطمہؓ کا جنازہ نہیں پڑھائے گا۔ پس ابو بکرؓ نے فاطمہؓ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور وہ رات کو دفن کر دی گئیں۔“

(ریاض النضرۃ جلد ۱ ص ۱۵۶)

علامہ ابن سعدؒ نے ”طبقات“ میں مکمل سند کے ساتھ یہ روایت درج کی

ہے:

”ابراہیم نخعیؒ نے کہا کہ ابو بکر صدیقؓ نے فاطمہؓ دختر رسول اللہ ﷺ پر نمازِ جنازہ پڑھی اور چار تکبیریں کہیں۔“

(طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹ طبع لیڈن یورپ)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؓ کی تدفین سے پہلے

حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ان کی وفات کی اطلاع ہی نہ دی لیکن یہ بات اس لیے قابل یقین نہیں کہ خود حضرت ابو بکر صدیقؓ کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس حضرت فاطمہؓ کی وفات سے پہلے ان کے پاس موجود تھیں اس لیے حضرت ابو بکر صدیقؓ ان کی وفات سے بے خبر کیسے رہ سکتے تھے۔

اس مسئلہ میں ہم ”واللہ اعلم بالصواب“ کہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔
سیدہ فاطمہؓ کی نماز جنازہ کسی نے بھی پڑھائی ہو اس سے ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ آخرت میں اس کے بارہ میں کسی سے سوال ہوگا۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ کی تدفین رات کے وقت عمل میں آئی۔ جنازہ بڑی خاموشی سے اٹھایا گیا اور اس میں بنو ہاشم کے علاوہ چند خاص صحابہ کرامؓ ہی شریک ہو سکے۔ ایک روایت میں ہے کہ سیدہؓ کو حضرت علیؓ، حضرت عباس بن عبدالمطلب اور حضرت فضل بن عباسؓ نے قبر میں اتارا۔ جائے تدفین کے بارے میں بھی روایتوں میں اختلاف ہے۔ اس سلسلہ کی مشہور روایتیں یہ ہیں:

(۱) سیدہ فاطمہؓ کا مدفن دارِ عقیل کے ایک گوشے میں ہے۔

(۲) جنت البقیع میں ہے۔

(۳) رسول اکرم ﷺ کے روضہ مبارک کے قریب ہے۔

(۴) سیدہ فاطمہؓ اپنے گھر میں مدفون ہوئیں جب مسجد نبویؐ میں توسیع کی گئی تو یہ جگہ شامل مسجد ہو گئی۔

مدینہ منورہ میں سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ سے منسوب مزار پر صدیوں تک ایک شاندار عمارت قائم رہی جب سعودی حکومت نے ایسی عمارتیں اور قبے منہدم کرائے تو اس عمارت کو بھی منہدم کرادیا۔

ان روایتوں کے اختلاف اور ہر ایک کے حق میں مختلف دلائل دیکھ کر ہمارے

لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ سیدۃ النساء کی آخری آرام گاہ کہاں بنی۔ اس لیے ہم یہاں بھی واللہ اعلم بالصواب کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ فی الحقیقت سیدۃ النساء کی حقیقی یادگار ان کا اسوہ یا سیرت و کردار ہے جس پر عمل کر کے ہماری خواتین دنیا اور عقبی میں فلاح پاسکتی ہیں۔

مورخ مسعودی نے بیان کیا ہے کہ سیدۃ فاطمہ کی تدفین کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ گھر واپس گئے تو سخت غمزدہ تھے اور بار بار یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

أَرَى عِلَلَ الدُّنْيَا عَلَيَّ كَثِيرَةً وَصَاحِبُهَا حَتَّى الْمَمَاتِ عَلِيلٌ
لِكُلِّ اجْتِمَاعٍ مِّنْ خَلِيلَيْنِ فُرْقَةٌ وَكُلُّ الدَّيِّ دُونَ الْفِرَاقِ قَلِيلٌ
وَإِنَّ افْتِقَادِي فَاطِمًا بَعْدَ أَحْمَدٍ دَلِيلٌ عَلَيَّ أَنْ لَا يَدُومَ خَلِيلٌ

(میں دیکھتا ہوں کہ دنیا کی بیماریوں اور مصیبتوں نے مجھے چاروں طرف سے آگھیرا ہے اور اہل دنیا جب تک دنیا میں ہیں بیمار ہیں، ہر ایک جائی کے بعد دوستوں سے مفارقت ہو کر رہتی ہے اور وہ زمانہ جو مفارقت کے سوا ہوتا ہے تھوڑا ہوتا ہے۔ احمد کے بعد فاطمہ کی مفارقت اس بات کی دلیل ہے کہ دوست ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کچھ عرصہ تک روزانہ حضرت فاطمہ الزہراء کی قبر پر تشریف لے جاتے، حضرت فاطمہ کو یاد کر کے روتے اور یہ شعر پڑھتے:

مَا لِي مَرَرْتُ عَلَى الْقُبُورِ مُسْلِمًا قَبْرَ الْحَبِيبِ فَلَمْ يَرُدَّ جَوَابِي
يَا قَبْرَ مَالِكٍ لَا تُجِيبُ مُنَادِيًا أَمَلْتُ بَعْدِي خُلَّةَ الْأَحْبَابِ

(خدا یا میری کیا حالت ہے کہ میں قبروں پر سلام کرنے آتا ہوں لیکن حبیب کی قبر میرے سوال کا جواب ہی نہیں دیتی۔ اے قبر تجھے کیا ہوا کہ پکارنے والے کو کوئی جواب نہیں دیتی کیا تو احباب کی محبت سے

رنجیدہ ہوگئی ہے)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراءؑ کی وفات کا علم اہل مدینہ کو
 ہوا تو تمام مرد اور عورتیں اشکبار ہو گئے۔ لوگوں پر اس طرح حیرت اور دہشت
 طاری ہوئی جس طرح سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے دن طاری ہوئی تھی۔
 حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ بادیۃً گریاں حضرت علی المرتضیٰؓ
 کے پاس گئے اور ان سے تعزیت کی۔



مناقب

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضرت علیؓ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

تَسَأَلْتِي عَنْ رَجُلٍ كَانَ مِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ تَحْتَهُ ابْنَتُهُ وَأَحَبُّ النَّاسِ إِلَيْهِ .

(تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو جو رسول اللہ ﷺ کے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضورؐ کی وہ بیٹی تھی جو آپؐ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی)

اس کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بلایا اور ان پر ایک چادر ڈال کر دعا مانگی۔

اللَّهُمَّ هَؤُلَاءِ أَهْلُ بَيْتِي فَادْهَبْ عَنْهُمْ الرَّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيرًا .

(اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے گندگی کو دور کر دے اور انہیں پاک کر دے)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ میں بھی تو آپؐ

۱۔ ایک روایت میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کالے رنگ کی ایک کملی تھی جس پر کچھ نقوش بنے ہوئے تھے۔ حضور نے حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کو بالترتیب اس کملی میں لے لیا۔

کے اہل بیت میں سے ہوں (یعنی مجھے بھی اس چادر میں داخل کر کے
میرے حق میں دعا فرمائیے)
حضور نے فرمایا:
”تم الگ رہو، تم تو خیر ہو ہی۔“

اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث مسلم، ترمذی، احمد بن حنبل،
ابن جریر طبری، حاکم، بیہقی وغیرہ محدثین نے حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ام
سلمہ، حضرت انس بن مالک، حضرت ابوسعید خدری، حضرت وائلہ بن اسقع اور
بعض دوسرے صحابہ کرام سے روایت کی ہیں۔ اسی بناء پر بعض مفسرین نے لکھا
ہے کہ سورہ احزاب کی اس آیت (آیہ تطہیر) کا اطلاق ازواج مطہرات کے علاوہ
حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین پر بھی ہوتا ہے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ
تَطْهِيرًا ○

(اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی سے گندگی کو دور کر دے اور تمہیں
پوری طرح پاک کر دے)

جس سیاق و سباق میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں
اہل البیت سے مراد ازواج مطہرات ہیں لیکن متعدد احادیث سے یہ بھی ثابت
ہوتا ہے کہ حضور نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین کو بھی
اپنا اہل البیت قرار دیا۔

مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم نے اپنی کتاب ”سیرت کبریٰ“ میں اہل
بیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”اہل بیت تین ہیں: — اہل بیت نسب، اہل بیت سکنی اور اہل بیت
ولادت — گو قرآن پاک میں امہات المؤمنین کے سوا کسی کے حق

میں ”اہل بیت“ کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اور لغتِ عرب میں بھی یہ لفظ بیویوں ہی کے لیے مستعمل ہے تاہم احادیثِ نبویہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرف بہ ایمان ہونے والے تمام ہاشمی اور آپؐ کی اولادِ اطہار بھی تبعاً اہل بیت میں شامل ہیں۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اہل بیت نسب میں ہاشم کی وہ تمام اولاد داخل ہے جس کو سعادتِ ایمانی حاصل ہوئی مثلاً حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، حضرت عقیلؓ بن ابی طالب، حضرت امّ ہانیؓ بن ابی طالب، جعفرؓ بن ابی طالب، حضرت علیؓ بن ابی طالب اور ان سب کی اولاد۔ حضرت نوفلؓ بن حارث، حضرت ربیعہؓ بن حارث، حضرت مغیرہ (ابوسفیان) بن حارث، عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث، حضورؐ کی مومنہ پھوپھیاں حضرت صفیہؓ، حضرت ارویؓ اور حضرت عاتکہؓ، عتبہؓ بن ابی لہب، معتبؓ بن ابی لہب، ذرہؓ بنت ابی لہب یہ سب اہل بیت نسب تھے۔

اہل بیت سکنی میں حضورؐ کی تمام ازواجِ مطہرات داخل ہیں۔ اہل بیت ولادت میں حضورؐ پر نور کی تمام اولادِ اطہار داخل ہے یعنی تین صاحبزادے قاسمؓ، عبداللہؓ اور ابراہیمؓ یہ سب صغریٰ میں فوت ہو گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت امّ کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ الزہراءؓ۔

حضرت انسؓ بن مالک سے یہ روایت ہے کہ آیہ تطہیر کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کا چھ مہینے تک یہ معمول رہا کہ صبح نمازِ فجر کے لیے نکلتے وقت سیدہ فاطمہؓ کے دروازے پر جا کر پکارتے:

”اے اہل بیت نماز پڑھو۔“

اور پھر یہ آیت (آیہ تطہیر) تلاوت فرماتے۔ (جامع ترمذی)

حضرت علیؑ نے غورابنتِ ابی جہل سے نکاح کا ارادہ کیا تو سرورِ عالم ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک گھر میں اکٹھی ہوں۔ اس موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

فَاطِمَةَ بِضْعَةَ مِثْقَالِ مِثْقَالٍ فَمَنْ أَغْضَبَهَا فَقَدْ أَغْضَبَنِي .

(فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے جو اس کو ناراض کرے گا وہ مجھ کو

ناراض کرے گا)۔ (صحیح بخاری ج ۱ صفحہ ۵۳۲)

بخاری ہی کی ایک اور حدیث میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا گیا ہے:

”فاطمہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے

مجھ کو اذیت دی“۔ (بخاری جلد ۲ ص ۶۸۷)

سیدہ فاطمہؑ الزہراءؑ کے مناقب میں کچھ اور احادیث حسب ذیل ہیں:

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ .

(فاطمہ اہل جنت کی خواتین کی سردار ہیں)۔ (البدایہ والنہایہ، حافظ ابن کثیر)

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جنت کی عورتوں کی سردار مریمؑ پھر فاطمہؑ بنتِ محمدؐ، پھر خدیجہؑ، پھر آسیہؑ

(فرعون کی بیوی) ہیں“۔ (”الاستیعاب“ حافظ ابن عبدالبر)

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تمہاری تقلید کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں مریمؑ، خدیجہؑ، فاطمہؑ اور آسیہؑ

(زوجہ فرعون) کافی ہیں“۔ (ترمذی کتاب المناقب)

☆ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے زمین پر چار خط کھینچے۔ پھر لوگوں سے فرمایا کہ تم

لوگ جانتے ہو کہ یہ کیا ہے۔ سب نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر

جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ”فاطمہ بنت محمد، خدیجہ بنت خویلد، مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم (زوجہ فرعون) ان لوگوں کو جنت کی عورتوں پر سب سے زیادہ فضیلت ہے۔“ (”الاستیعاب“ حافظ ابن عبد البر)

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”فاطمہ سیدۃ نساء العالمین (تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار) ہیں۔“

(”الاصابہ“ حافظ ابن حجر)

☆ رسول اللہ نے فرمایا:

”فاطمہ خواتین امت (یا خواتین مومنین) کی سردار ہیں۔“

(صحیح بخاری باب علامات النبوة فی الاسلام ص ۵۱۲)

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”فاطمہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گی۔“ (کنز العمال)

☆ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَغْضِبُ لِعِغْظِكَ وَيَرْضَى لِرِضَاكَ .

(جس سے تو ناراض ہوگی اللہ بھی اس سے ناراض ہوگا اور جس سے تو راضی

ہوگی اللہ بھی اس سے راضی ہوگا)۔ (متدرک الصحیحین)

حضرت فاطمہ کے مناقب و فضائل میں ایسی اور بھی کئی حدیثیں صحاح ستہ اور دوسری کتابوں میں ملتی ہیں۔ یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جمہور اہل سنت و جماعت کے نزدیک خلفائے راشدین کے بعد ازواج مطہرات تمام صحابہ اور صحابیات سے افضل ہیں اور ازواج مطہرات میں بھی ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن سیدہ فاطمہ الزہراء کے فضائل و مناقب میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کے

پیش نظر ان عظیم المرتبت خواتین کے مرتبہ کے تعین میں علماء میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر اردو دائرہ معارف اسلامیہ (دانش گاہ پنجاب) اور سیرۃ عائشہ (مولفہ سید سلیمان ندوی) میں جو بحث کی گئی ہے ہم اس کو یہاں بجنسہ نقل کر دیں۔ قارئین اس سے جو بھی نتیجہ اخذ کریں وہ ان کی صوابدید پر منحصر ہے۔ ”اردو دائرہ معارف اسلامیہ“ میں ہے:

”حضرت فاطمہؓ کی فضیلت کا مسئلہ ہماری اپنی تصانیف میں بڑی اہمیت کا مالک رہا ہے مگر بعض موقعوں پر قدرے غلو عقیدت کا شائبہ بھی آ گیا ہے۔ بہر حال ان کے افضل النساء ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے اس تفضیلی رجحان میں سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ اور ان کی دوسری بہنوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور آٹھ جہات سے انہیں کو باقی بہنوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

(دیکھئے ابن حجر لہتمی: ”الفتاویٰ الحدیثہ، مصر ۱۳۵۰ھ ص ۲۲)

عقیدت کے یہ جملہ مظاہر طبعی ہیں کیونکہ ان کی ذات رسول پاکؐ کو عزیز تھی۔ بعض لوگ اس پر مصر ہیں کہ اہل بیت، آل الکساء اور آل العباء کی تعبیروں سے بالخصوص مباہلے کے لیے نکلنے والے افراد یعنی آنحضرتؐ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ مراد ہیں۔

(البیہاوی: تفسیر: ۱: ۵۰۱ تا ۵۱۱ و ۳: ۴۰۷ اور الحازن: تفسیر: ۱: ۵۱۱ و ۵: ۳۰۶ بعد وغیرہ)

حضرت فاطمہؓ کے جنت کی عورتوں کی سیدہ (یعنی سردار) ہونے سے متعلق جو احادیث ہیں (دیکھئے ابن عبدالبر: ”الاستیعاب ۲: ۲۷۶ بعد، ابو نعیم: حلیۃ، مصر ۱۳۵۱ھ، ۲: ۴۳) وہ بھی ان محترمہ خواتین کے مقابلے میں جن کے نام ان میں مذکور ہیں، حضرت فاطمہؓ کی قدر و منزلت کی تعین کے مسئلے کو پیش منظر میں لے آتی ہیں۔ اس بارے میں جو فیصلے کیے گئے ہیں وہ متنازع فیہ ہیں۔ ایسی حدیثوں میں

سے ایک حدیث یہ ہے کہ حضرت فاطمہؑ آنحضرتؐ کا ایک جزو ہیں۔

(البخاری، ۲۱:۴، نیز العزیزی: شرح الجامع الصغیر، ۱:۲۷۱)

بعض لوگ عورتوں میں حضرت مریمؑ کا درجہ سب سے اونچا مانتے ہیں اور ان کے بعد حضرت فاطمہؑ کو اور ان کے بعد ان کی والدہ حضرت خدیجہؑ کو شمار کرتے ہیں
(الحضنی: حاشیہ علی الجامع الصغیر، بولاق ۱۲۹۰ھ، ۱:۱۵۶)

افضلیت کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؑ اور حضرت فاطمہؑ میں کون زیادہ بلند مرتبہ رکھتی ہیں اور یہ مسئلہ علم کلام میں ایک بحث کا موضوع بن گیا ہے۔ اس بارے میں جو فیصلے کیے گئے ہیں وہ عموماً اس نوعیت کے ہیں جن سے ان دونوں کو ایک مساوی درجہ دینے کا میلان پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف حضرت عائشہؑ کو حضرت فاطمہؑ سے اس لیے زیادہ بلند مرتبہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے حضرت فاطمہؑ کی نسبت بہت زیادہ احادیث مروی ہیں۔

(سراج الدین الفرغانی: الامالی ترکی ترجمہ از حافظ رفیع، استانبول ۱۳۰۲ھ ص ۲۴)

تو دوسری طرف حضرت فاطمہؑ، حضرت عائشہؑ سے اس نقطہ نظر سے افضل ہیں کہ انہیں آنحضرتؐ کا جزو کہا گیا ہے۔

(دیکھئے نیز ملا علی القاری: شرح فقہ الاکبر، مصر ۱۳۲۳ھ، ص ۱۰۷ بعد)

ظاہریوں میں سے ابن حزم الاندلسی حضرت عائشہؑ کے دیگر سب اصحاب رسولؐ (بشمول حضرت فاطمہؑ) سے افضل ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے۔ (الفصل فی المثل والاهواء والنحل، مصر ۱۳۲۱ھ، ۴:۱۱۹) مگر الالوسی اس کے برعکس حضرت فاطمہؑ کو حضرت عائشہؑ سے ہر جہت سے برتر سمجھتا ہے۔

(روح المعانی، ۱:۵۷۸) (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۵ ص ۹۳-۹۴)

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ”سیرۃ عائشہؑ“ میں اس مسئلہ پر یوں خامہ فرسائی کی ہے:

”تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ اسلام میں حضرت خدیجہ

الکبریٰ، حضرت فاطمہ زہراءؑ اور حضرت عائشہ صدیقہ مہجورہ میں سب سے افضل ہیں۔ جمہور علماء نے سب سے پہلے حضرت فاطمہؑ، پھر حضرت خدیجہؑ اور تیسرے درجہ میں حضرت عائشہؑ کا نام رکھا ہے لیکن یہ ترتیب کسی نص شرعی یا حدیث صحیح سے ثابت نہیں بلکہ علماء نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد اور ذوق سے یہ ترتیب قائم کی ہے۔ ان تینوں خواتین کے الگ الگ فضائل اور مناقب احادیث میں مروی ہیں۔ اسی لیے بعض علماء نے اس بات میں توقف مناسب سمجھا ہے۔ علامہ ابن حزم نے تمام علماء کے برخلاف علانیہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عائشہؑ نہ صرف اہل بیت میں نہ صرف عورتوں میں بلکہ صحابہؓ میں آنحضرتؐ کے بعد سب سے افضل ہیں۔ اس دعویٰ پر ان کے بہت سے دلائل ہیں جس کو شوق ہو وہ ”ملل و نحل“ میں فصل صحابہؓ کی بحث کی طرف رجوع کرے۔ ہمارا اعتقاد اس بارے میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ کے ساتھ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فضیلت سے مقصود اگر درجہء اخروی ہے تو اس کا حال خدا ہی کو معلوم ہے لیکن دنیاوی حیثیت سے حقیقت یہ ہے کہ ان کے فضائل مختلف الجہات ہیں۔ اگر نسبی شرافت کا اعتبار ہے تو حضرت فاطمہ زہراءؑ سب سے افضل ہیں اگر ایمان کی سابقیت اسلام کی ابتدائی مشکلات کے مقابلہ اور اس زمانہ میں حضرت رسالت مآبؐ کی اعانت و تسکین خاطر کی حیثیت سے دیکھئے تو حضرت خدیجہ کبریٰؑ کی بزرگی سب پر مقدم ہے لیکن اگر علمی کمالات، دینی خدمات اور آنحضرتؐ کی تعلیمات و ارشادات کے نشر و اشاعت کی فضیلت کا پہلو سامنے ہو تو ان میں صدیقہ کبریٰؑ کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔“

(زرقانی بر مواہب جلد ۳ صفحہ ۳۶۹، حضرت خدیجہؑ کا حال)

زوجِ بتولؑ

حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ

رحمتِ عالم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو چند ماہ بعد آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو ایک جگہ جمع کیا اور ان کے درمیان رشتہء مواخاۃ کا سلسلہ قائم فرمایا۔ اس سے پہلے مہاجرین، مسلمانانِ مدینہ کے مہمان تھے لیکن اب وہ ان سے رشتہء اخوت و یگانگت میں منسلک ہو گئے اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ایسی بے پناہ محبت اور خیر خواہی پیدا ہو گئی کہ حقیقی بھائیوں میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس موقع پر حضورؐ نے اپنے ایک نوجوان جاں نثار کو ویسے ہی چھوڑ دیا اور ان کا رشتہ مواخاۃ کسی سے قائم نہ فرمایا۔ یہ مہاجر نوجوان جن کی پیشانی نورِ سعادت سے درخشاں تھی، کچھ آزرہ سے ہو گئے اور آگے بڑھ کر بارگاہِ رسالتؐ میں یوں عرض پیرا ہوئے:

”یا رسول اللہ آپؐ نے تمام اصحاب کے درمیان مواخاۃ قائم کرائی ہے لیکن میری مواخاۃ کسی سے نہیں کرائی۔“

سید الانامؑ نے اس نوجوان کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں پکڑ لیا اور بڑی محبت سے ان کا نام لے کر فرمایا:

”تم میرے بھائی ہو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔“

حضور کا ارشاد گرامی سن کر وہ نوجوان فرط مسرت سے بے خود ہو گئے اور بے اختیار ان کی زبان پر تہلیل و تہمید جاری ہو گئی۔

اس واقعہ کے آٹھ سال بعد چشمِ فلک نے اسی سرزمینِ مدینہ پر ایک اور منظر دیکھا۔ ۹۔ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ غزوہ تبوک کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہونے لگے تو آپ کو ضرورت محسوس ہوئی کہ مدینہ منورہ میں اپنا ایک ایسا قابلِ اعتماد اور قوی جانشین چھوڑ جائیں جو مجاہدین کے اہل و عیال کی حفاظت بھی کر سکے اور منافقین کی شرارتوں کی روک تھام بھی کر سکے۔ اس مقصد کے لیے آپ کی نظر انتخاب اسی نوجوانِ سعادت مند پر پڑی جس کو آپ نے عقدِ مواخاۃ کے موقع پر دنیا اور آخرت میں اپنا بھائی بنایا تھا۔ حضور نے ان کو اس ذمہ داری سے آگاہ فرمایا تو وہ دل و جان سے ارشادِ نبوی کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے لیکن منافقین کی زبانوں کو کون لگام دے سکتا تھا۔ انہوں نے حضور کے اس جاں نثار کو پُر صعوبت سفر اور جہادِ نبیل اللہ سے گریز کا طعنہ دیا تو وہ مسلح ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

”یا رسول اللہ میں نے ابتدا سے لے کر آج تک کسی موقع پر بھی راہِ حق میں جان لڑانے سے گریز نہیں کیا لیکن اس دفعہ مجھے جہادِ نبیل اللہ میں شریک ہونے سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟“

رحمتِ عالم ﷺ نے شوقِ جہاد سے بے تاب اپنے اس مخلص شیدائی پر محبت اور شفقت بھری نظر ڈالی اور فرمایا:

”کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تمہیں میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔“ (صحیح بخاری)

یہ خوش بخت جوان جن کو سید المرسلین فخرِ موجودات صاحبِ قابِ قوسین ساقی

کوثر نے دنیا اور دین میں اپنا بھائی قرار دیا اور جن کی اپنے ساتھ نسبت کو اس نسبت سے تشبیہ دی جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو حضرت ہارون سے تھی، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ بن ابی طالب تھے۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ آسمان فضائل کا مہر عالمتاب ہیں۔ ان کے اوصاف و محاسن اور فضائل و مناقب میں سے ایک ایک تاج افتخار کا گوہر شاہوار کہے جانے کا مستحق ہے۔ اگرچہ ”برادر خیر البشر“ کی جلالتِ قدر پر مسلمانوں کے سبھی مکاتبِ فکر کا اتفاق ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ملتِ اسلامیہ کی اس متاعِ گرانبیہ پر کسی بھی زبان میں آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں افراط و تفریط اور غلو و عصیبت سے دامن بچا کر ان کی جامع فضل و کمال شخصیت کو متوازن اور صحیح طریقے سے پیش کیا گیا ہو۔ بعض نے اگر عقیدت اور محبت کے جوش میں حضرت والا کو ایک مافوق الفطرت ہستی بنا دیا ہے تو دوسروں نے اس کے ردِ عمل میں ان کے مقام و مرتبہ کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ ایک فریق کا رویہ درست ہے اور نہ دوسرے کا۔ معلوم نہیں اسلام کے اس بطلِ جلیل کی ایک جامع اور متوازن سیرت نگاری کی سعادت کب اور کس شخص کو نصیب ہو۔ ایک مختصر مضمون میں تو یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی درخشندہ سیرت و کردار کی چند جھلکیاں پیش کر دی جائیں۔

اسمِ گرامی علی ہے۔ مشہور القاب حیدر، مرتضیٰ اور اسد اللہ ہیں۔ کنیت ابوالحسن اور ابو تراب تھی۔ مؤخر الذکر کنیت کو وہ بہت عزیز جانتے تھے کیونکہ یہ عطیہ رسول تھی۔

حسب و نسب کے لیے اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا حضرت ابوطالب بن عبدالمطلب کے فرزند تھے۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھا جو حضرت ابوطالب کی بنتِ عم تھیں۔ اس طرح حضرت علی باپ اور ماں

دونوں کی طرف سے ہاشمی تھے۔

حضرت ابوطالب نے قریش کے مقابلے میں حضورؐ کی جس طرح سرپرستی، مدافعت اور حمایت کی وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے۔ اسی طرح حضرت علیؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد نے بھی نہایت خلوص اور دلسوزی کے ساتھ حضورؐ کی سرپرستی اور حمایت کی۔ جب انہوں نے وفات پائی تو حضورؐ نے انہیں اپنی قمیص مبارک کا کفن پہنایا اور ان کی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا:

”اے میری ماں اللہ آپ پر رحم کرے۔ آپ میری ماں کے بعد ماں تھیں۔ آپ خود بھوکی رہتی تھیں مگر مجھے کھلاتی تھیں۔ آپ کو خود لباس کی ضرورت ہوتی تھی لیکن آپ مجھے پہناتی تھیں۔“

گویا حضرت علیؑ کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ دونوں سرور کونین کے مربی اور محسن تھے۔ حضرت علیؑ صرف ”ابن عم مصطفیٰ“ ہی نہیں تھے بلکہ آپ کے مواخاتی بھائی بھی تھے اور آپ کی لخت جگر سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہراء کے شوہر (زوج بتول) بھی۔

سیدنا علیؑ کی ولادت ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل کو (بعثت نبوی سے دس سال اور ہجرت نبوی سے ۲۳ سال قبل) جمعۃ المبارک کے دن مکہ معظمہ میں ہوئی۔ حضرت ابوطالب کی کثیر العیالی اور تنگدستی دیکھ کر حضورؐ نے ان کا بوجھ ہلکا کرنے کی یہ تجویز سوچی کہ جب حضرت علیؑ ذرا سیانے ہوئے تو ان کو اپنی کفالت میں لے لیا گیا وہ ۴-۵ برس کی عمر سے حضور کے دامن اقدس سے وابستہ ہو گئے اور آغوش نبوت میں پرورش اور تربیت پائی۔

بعثت نبوی کے بعد جن چار نفوس قدسی کو سب سے پہلے قبول اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں سے ایک حضرت علیؑ تھے۔ اس سلسلہ کی مختلف احادیث کو جمہور علماء نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ خواتین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ،

مردوں میں حضرت ابو بکر صدیقؓ آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ اور بچوں میں حضرت علیؓ سب سے پہلے سعادت اندوز ایمان ہوئے۔ طبری اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ قبول اسلام کے بعد حضرت علیؓ نے حضورؐ کے ساتھ نماز پڑھنی شروع کر دی۔ ایک دن حضرت ابوطالب نے انہیں نماز پڑھتے دیکھا تو پوچھا، ”بیٹا یہ کیا دین ہے جس پر تو چل رہا ہے؟“ انہوں نے کہا — ”ابا جان میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا ہوں ان کی تصدیق کی ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔“ ابوطالب نے کہا:

”محمدؐ تمہیں بھلائی کے سوا کبھی کسی چیز کی طرف نہیں بلائیں گے، تم ان کے ساتھ لگے رہو۔“

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ”ازالۃ الخفاء عن خلافة الخلفاء“ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

”الہی میں نہیں جانتا کہ تیرے نبیؐ کے سوا اس امت میں مجھ سے پہلے کسی نے تیری عبادت کی ہو۔“

اس فقرے کو تین بار کہا، پھر سات بار یہ کہا:

”میں نے سب لوگوں سے پہلے (حضورؐ کے ساتھ) نماز پڑھی۔“

تفسیر ابن کثیر، مسند احمد، مسند بزار، تاریخ ابوالفدا اور بعض دوسری کتابوں میں روایت ہے کہ ۴۲ نبوت کے آغاز میں جب آیت **وَإِنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ** (اور اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو خدا کا خوف دلائیے) نازل ہوئی تو حضورؐ نے چند دن بعد بنو ہاشم کو کھانے پر بلایا۔ انتالیس یا چالیس آدمی مدعو تھے۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو حضورؐ نے کھڑے ہو کر ایک تقریر کی جس میں فرمایا کہ میں آپ کو ایک ایسی بات کی طرف دعوت دیتا ہوں جو دنیوی اور اخروی فلاح کی کفیل ہے اور میں نہیں جانتا کہ عرب بھر میں کوئی شخص اپنی قوم کے

لیے ایسا بیش بہا تحفہ لایا ہو۔ آپ میں سے کون میری دعوت کو قبول کرتا ہے اور میرا بھائی اور ساتھی بنتا ہے؟

حضورؐ کی تقریر سن کر سب لوگ خاموش رہے لیکن حضرت علیؑ نے اٹھ کر عرض کیا: ”اگرچہ میری عمر کم ہے تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔“ ان کی بات سن کر دوسرے لوگ ہنسنے لگے۔ اس وقت حضرت علیؑ کی عمر تیرہ برس کی تھی۔

ابن ابی حاتم نے یہ واقعہ کسی قدر مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر حضورؐ نے فرمایا:

”تم میں سے کون میرے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری اور میرے

پیچھے میرے اہل میں میری نیابت کے لیے تیار ہوتا ہے؟“

سب خاموش رہے، حضرت علیؑ کہتے ہیں میں اپنے چچا عباسؑ کی بزرگی کی وجہ سے کچھ نہ بولا۔ جب دوسری مرتبہ حضورؐ نے اپنا ارشاد دہرایا اور میں نے پھر بھی عباسؑ کو خاموش دیکھا تو میں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ میں ذمہ داری لیتا ہوں، اگرچہ ان دنوں میرا حال بودا تھا، آنکھیں آئی ہوئی تھیں، پیٹ بڑھا ہوا تھا اور ٹانگیں پتلی تھیں۔“

ابن جریر طبریؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے اپنے اہل خاندان کو توحید کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اور تو سب چپ رہے البتہ حضرت علیؑ نے اٹھ کر عرض کیا، گو میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں، میری ٹانگیں پتلی ہیں اور مجھے آشوب چشم کا عارضہ بھی ہے تاہم میں آپ کا ساتھی اور مددگار بنوں گا۔ حضورؐ نے انہیں بٹھا دیا اور دوسری مرتبہ لوگوں سے خطاب فرمایا۔ اب کی بار بھی صرف حضرت علیؑ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ تیسری مرتبہ بھی ایسی ہی صورت پیش آئی۔

واقعہ کی صورت کچھ بھی ہو، حضرت علیؑ نے حضورؐ سے جو پیمانہ وفا باندھا اسے اپنے عمل سے سچ کر دکھایا اور تنگی، آسانی، دکھ سکھ، ہر حال میں فداکاری کا ایمان

افروز نمونہ پیش کیا۔ ہجرتِ نبوی تک ان کا یہ حال تھا کہ ہر وقت بارگاہِ رسالت میں حاضر رہتے تھے۔ حضورؐ تبلیغِ حق کے لیے عام مجموعوں میں تشریف لے جاتے تھے تو حضرت علیؑ کو کبھی گھر چھوڑ جاتے تھے اور کبھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ بعدِ بعثت میں مشرکین نے بنو ہاشم اور بنو مُطَلِّب کو شعبِ ابی طالب میں محصور کیا تو حضرت علیؑ کو بھی حضورؐ کی حمایت میں اپنے والدین اور دوسرے اقربا کے ساتھ تین برس تک ہولناک مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ ۱۰ء بعدِ بعثت میں یہ محاصرہ ختم ہوا تو چند ماہ بعد شفیق باپ کا سایہ شفقت سر سے اٹھ گیا تاہم حضورؐ کی مشفقانہ سرپرستی نے انہیں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ حضرت ابوطالب اور پھر حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات کے بعد سرورِ عالم ﷺ اور آپ کے صحابہ کے لیے حالات سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۳ء بعدِ بعثت میں آپ کو ہجرت الی المدینہ کا اذن ہو گیا۔

ہجرتِ نبوی کے موقع پر حضرت علیؑ کو یہ لازوال شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ نے (اپنی ہجرت کے بعد) انہیں اہل مکہ کی امانتیں واپس کرنے کی ذمہ داری سپرد فرمائی اور کاشانہء اقدس سے نکلتے وقت اپنے بستر پر اپنی سبز حضموتی چادر اوڑھا کر لٹا دیا۔ اگرچہ سیدنا علیؑ کے لیے یہ کام جان پر کھیلنے کے مترادف تھا لیکن وہ کسی تامل کے بغیر بخوشی حضورؐ کے بستر پر لیٹ گئے اور حضورؐ اطمینان سے مشرکین کے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے ان کے درمیان سے نکل گئے۔ صبح ہوئی اور کاشانہء اقدس کے گرد گھیرا ڈالنے والے کفار نے حضرت علیؑ کو حضورؐ کے بستر مبارک سے اٹھتے دیکھا تو سٹپٹا کر رہ گئے۔ ابن جریر طبریؒ اور ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت علیؑ کو گھیر لیا اور ان سے پوچھا: ”محمدؐ کہاں ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا ”میں کیا بتا سکتا ہوں، تم لوگوں نے انہیں نکلنے پر مجبور کیا اور وہ نکل گئے۔“ مشرکین نے انہیں بہت ڈرایا دھمکایا، یہاں تک کہ ان پر ہاتھ اٹھانے سے

بھی گریز نہ کیا۔ اس کے بعد مسجد حرام میں کچھ دیر محبوس رکھا لیکن جب دیکھا کہ ان سے کچھ معلوم کرنا ممکن نہیں تو انہیں چھوڑ دیا۔

سرورِ عالم ﷺ نے مکہ سے ہجرت کے بعد چند دن قباء میں قیام فرمایا۔ ابھی آپ قباء ہی میں تھے کہ حضرت علیؓ بھی ہجرت کر کے آپ کی خدمت اقدس میں قباء پہنچ گئے۔ حضورؐ کے میزبان حضرت کلثومؓ بن الہدم انصاری نے انہیں بھی اپنا مہمان بنا لیا۔ طبری نے اپنی روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ جب حضرت علیؓ قباء پہنچے تو پا پیادہ سفر کرنے کی وجہ سے ان کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے۔

سرورِ عالم ﷺ قباء سے خاص مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ بھی آپ کے ہم رکاب تھے۔ کچھ عرصہ بعد مسجد نبویؐ کی تعمیر کا آغاز ہوا تو حضورؐ اور دوسرے صحابہؓ کے ساتھ مل کر حضرت علیؓ نے بھی اس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ زرقانی کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ اینٹیں اور گارا ڈھو ڈھو کر لاتے تھے اور ساتھ ساتھ یہ رجز پڑھتے تھے:

لَا يَسْتَوِي مَنْ يَغْمُرُ الْمَسَاجِدَا

يَدَانِبُ فِيهِ قَائِمًا وَقَاعِدًا

وَمَنْ يَرِي عَنِ الْغُبَارِ حَائِدًا

(جو مسجد تعمیر کرتا ہے کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اس مشقت کو برداشت کرتا

ہے اور جو گرد و غبار کی وجہ سے اس کام سے گریز کرتا ہے وہ دونوں

برابر نہیں ہو سکتے)

مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان عقد

مواخات قائم کرایا تو حضرت علیؓ کو اپنا مواخاتی بھائی بنایا۔

غزوات کا آغاز ہوا تو چرخ نیلی فام نے دیکھا کہ بدر ہو یا احد، خندق ہو یا

خیمبر ہر معرکے میں سیدنا علیؓ شمشیر بکف اور سینہ سپر سرفروشی کے جوہر دکھا رہے

ہیں، جدھر جھک پڑھتے ہیں دشمن کی صفیں کائی کی طرح پھٹ کر راستہ دے دیتی ہیں۔ ان کی خداداد شجاعت کو دوست اور دشمن سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ خود سیدنا علیؑ کا قول ہے کہ میدانِ رزم میں مجھے پروا نہیں ہوتی تھی کہ موت میری طرف آرہی ہے یا میں موت کی طرف جا رہا ہوں۔

رمضان المبارک ۲ھ میں سرورِ عالم ﷺ غزوہ بدر کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو سوار یوں کی قلت کی وجہ سے دو دو تین تین آدمیوں کو ایک ایک اونٹ سواری کے لیے دیا گیا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضورؐ کے ساتھ سواری میں حضرت علیؑ اور حضرت زید بن حارثہ شریک تھے۔ مولانا سعید انصاری نے ”سیر الصحابہ“ میں لکھا ہے کہ اسلامی لشکر کے جھنڈوں میں ایک جھنڈا حضرت علیؑ کے پاس تھا۔

جب حضورؐ میدانِ بدر کے قریب پہنچے تو آپؐ نے حضرت علیؑ کو چند آزمودہ کارسرفروشوں کے ساتھ قریش مکہ کی نقل و حرکت کی ٹوہ لینے کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت علیؑ نے یہ اہم خدمت بڑی خوبی سے انجام دی۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے مشرکین کی صفوں سے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ تلواریں ہلاتے ہوئے نکلے اور مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی۔ لشکرِ اسلام سے تین انصاری جانباز ان کے مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ قریشی جنگجوؤں کو جب معلوم ہوا کہ ان کے مقابل ہونے والے تینوں جانباز مدینہ کے باشندے ہیں تو انہوں نے ان سے لڑنا اپنی توہین سمجھا اور باوازِ بلند کہا، ”محمدؐ یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں ہیں ہماری قوم اور کفو کے لوگوں کو ہمارے مقابلے پر بھیجو“۔

اس پر حضورؐ نے حضرت علیؑ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہ بن الحارث کو حکم دیا کہ جاؤ اور ان لوگوں کا مقابلہ کرو۔ حضورؐ کا ارشاد سنتے ہی یہ تینوں بہادر اپنے حریفوں کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ حضرت علیؑ اور حضرت حمزہؓ نے آنا فانا اپنے

اپنے حریف کو خاک و خون میں لوٹا دیا۔ (حضرت علیؑ کا مد مقابل ولید بن عتبہ تھا) البتہ حضرت عبیدہؓ کو ان کے حریف نے زخمی کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؑ اور حضرت حمزہؓ فوراً حضرت عبیدہؓ کی امداد کو پہنچ گئے اور ان کے حریف کو جہنم واصل کر کے زخمی عبیدہؓ کو میدان جنگ سے اٹھالائے۔ عام لڑائی شروع ہوئی تو حضرت علیؑ کی تلوار دشمنوں کے لیے برقی بے امان بن گئی اور اس نے ان کے خرمین ہستی کو خاکستر کر دیا۔ مشرکین کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ ان کے ستر آدمی میدان جنگ میں کھیت رہے اور ستر مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے۔ اس لڑائی میں قریش کے جو مشہور جنگجو حضرت علیؑ کے ہاتھ سے قتل ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔ ولید بن عتبہ، حارث بن ربیعہ، حنظلہ بن ابی سفیان، عقیل بن الاسود، نوفل بن خویلد، عاص بن سعید، حرمہ بن عمرو بن ابی عتبہ، ابو قیس بن الولید، مسعود بن ابی امیہ، عبداللہ بن ابی رفاعہ، حاجز بن سائب بن عویمر، نبیہ بن الحجاج، عاص بن مدبہ، زمعہ بن الاسود، حارث بن زمعہ، عمرو بن عثمان بن کعب، مالک بن طلحہ، ابن تیم ان کے علاوہ کچھ اور مشرکین بھی تیغ علیؑ کا شکار ہوئے۔ ایک مشرک عمرو بن ابی سفیان کو حضرت علیؑ نے قیدی بنایا۔ جنگ کے بعد حضورؐ نے مالِ غنیمت میں سے ایک اونٹ، ایک زرہ اور ایک تلوار حضرت علیؑ کو عطا فرمائی۔

اسی سال (۲ھ میں) سرورِ عالم ﷺ نے اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہ الزہراءؑ کا نکاح حضرت علیؑ سے کر دیا اور دونوں میاں بیوی کے حق میں دعائے خیر و برکت فرمائی۔ چند ماہ بعد حضرت فاطمہؑ رخصت ہو کر حضرت علیؑ کے گھر گئیں تو اس موقع پر حضورؐ نے حضرت فاطمہؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”جانِ پدر! میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان کے بہترین شخص سے کی ہے۔“ (ابن سعد و طبرانی)

۳ھ میں غزوہٴ احد پیش آیا۔ لڑائی کے آغاز سے پہلے مشرکوں کے علمبردار طلحہ

بن ابی طلحہ نے مبارزِ طلحی کی تو حضرت علیؑ اس کے مقابلے کے لیے نکلے۔ ابن ابی طلحہ قریش کا نامی بہادر تھا لیکن شیرِ خدا نے اسے ایک ہی وار میں ڈھیر کر دیا۔ اس موقع پر حضورؐ نے تکبیر کا نعرہ بلند کر کے اظہارِ مسرت فرمایا۔ اس کے بعد طلحہ بن ابی طلحہ کے دو بھائی اور تین بیٹے یکے بعد دیگرے میدان میں نکلے اور سب مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ ان کے بعد ارطاة بن شرجیل ہنکارتا ہوا میدان میں آیا۔ حضرت علیؑ نے لپک کر اس کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ عام لڑائی شروع ہوئی تو حضرت علیؑ شروع سے اخیر تک میدانِ جنگ میں کوہِ استقامت بن کر ڈٹے رہے۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے مسلمانوں میں انتشار پھیلا تو مشرکین نے بڑھ بڑھ کر ذاتِ رسالت مآبؐ پر حملے شروع کر دیئے۔ اس موقع پر حضورؐ کے قریب جو جاں نثار موجود تھے انہوں نے آپؐ کی حفاظت کے لیے سرِ دھڑ کی بازی لگا دی، ان میں حضرت علیؑ بھی شامل تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ علمبردارِ اسلام حضرت مصعبؓ بن عمیر کی شہادت کے بعد حضرت علیؑ نے آگے بڑھ کر علمِ سنبھال لیا تھا۔ ایک موقع پر جب مشرکین چاروں طرف سے حضورؐ پر ٹوٹے پڑتے تھے حضرت علیؑ نے اس بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا کہ سب کا منہ پھر گیا۔ پھر ایک اور گروہ نے حضورؐ پر زغہ کیا۔ حضرت علیؑ نے اس کو بھی بھگا دیا اس وقت لسانِ رسالتؐ سے یہ الفاظ ادا ہوئے:

”علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔“

ابن ہشام کا بیان ہے کہ غزوہٴ احد میں ابوسعید بن ابی طلحہ نے مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی تو حضرت علیؑ اس کے مقابل ہوئے اور تلوار کے ایک بھرپور وار سے اس کو زمین پر گرا دیا۔ اس کا سر قلم کرنے کے لیے دوسرا وار کیا ہی چاہتے تھے کہ وہ برہنہ ہو گیا۔ حضرت علیؑ نے اس حالت میں اس کو قتل کرنا پسند نہ کیا اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ لڑائی میں حضورؐ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ جب مشرکین میدان جنگ سے ہٹ گئے اور صحابہ کرامؓ حضورؐ کو پہاڑ پر لے گئے تو حضرت علیؓ ڈھال میں پانی بھر بھر کر لاتے تھے اور حضرت فاطمہ الزہراءؓ حضورؐ کے چہرہ اقدس کا خون دھوتی تھیں۔ جب خون بند نہ ہوا تو حضرت فاطمہؓ نے چٹائی جلا کر راکھ زخم پر ڈالی۔

۴ ہجری میں یہود بنی نضیر نے عہد شکنی کی تو حضورؐ نے ان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ پندرہ دن تک جاری رہا۔ اس تمام عرصے میں حضرت علیؓ حضورؐ کے ہمراہ رہے اور اپنے شجاعانہ حملوں سے بنو نضیر کا ناطقہ بند کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ حضورؐ نے ان کے لیے یہی سزا کافی سمجھی کہ انہیں خیبر کی طرف جلا وطن کر دیا۔

۵ ہجری میں عرب کے مشرکین اور یہود متحد ہو کر مدینہ منورہ پر چڑھ آئے اور غزوہ احزاب (خندق) پیش آیا۔ مسلمانوں نے خندق کھود کر کفار کے ٹڈی دل کو مدینہ منورہ میں گھسنے سے روک دیا لیکن وہ دور سے تیر اور پتھر برساتے رہتے تھے۔ ایک دن ان کے چند نامور جنگجوؤں نے خندق عبور کر لی۔ ان میں عمرو بن عبدودؓ بھی تھا جو ایک ہزار سواروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے لکارا تو حضرت علیؓ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضورؐ نے یہ فرما کر ان کو بٹھا دیا کہ یہ عمرو بن عبدودؓ ہے۔ اس نے دوبارہ دعوت مبارزت دی تو حضرت علیؓ پھر کھڑے ہو گئے، لیکن حضورؐ نے اب کی بار بھی انہیں بٹھا دیا۔ تیسری دفعہ اس نے مسلمانوں کو لکارا تو حضرت علیؓ نے بے تاب ہو کر عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو بن عبدودؓ ہے مجھے اس کے مقابلے پر جانے دیجیے“۔ اب حضورؐ نے ان کو اجازت دے دی اپنی تلوار مرحمت فرمائی اور اپنے دست مبارک سے ان کے سر پر عمامہ باندھا۔ حضرت علیؓ دوڑتے

ہوئے عمرو بن عبدود کے مقابل ہوئے اور اس سے پوچھا، ”کیا یہ تیرا قول ہے کہ جو شخص تجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو اُن میں سے ایک ضرور قبول کرے گا۔“ اس نے کہا ”ہاں“ حضرت علیؑ نے فرمایا، ”میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسلام لا“ اس نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا، تو پھر میں تجھ سے اس بات کا خواستگار ہوں کہ مسلمانوں سے مت لڑ اور اپنے گھر جا کر آرام سے بیٹھ۔ عمرو بن عبدود نے کہا ”اس طرح عرب کی عورتیں مجھ پر ہنسیں گی۔ میں نے نذر مان رکھی ہے کہ جب تک محمدؐ سے بدر کا بدلہ نہ لے لوں گا اپنے سر میں تیل نہیں ڈالوں گا۔ میں اپنی نذر پوری کیے بغیر پیچھے ہٹنے کا نہیں۔“ حضرت علیؑ بولے ”تو آ مجھ سے لڑ۔“

عمرو بن عبدود نوے سال کا گرگِ باراں دیدہ تھا۔ حضرت علیؑ کی بات سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا یہ بات میرے حاشیہء خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ عرب میں کوئی شخص مجھ سے نبرد آزما ہونے کی خواہش کرے گا۔ یہ کہہ کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا، کیونکہ حضرت علیؑ پیادہ تھے۔ پھر حضرت علیؑ سے پوچھا ”تم کون ہو؟“ انہوں نے اپنا نام بتایا تو بولا، ”میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے اور تمہارے والد کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔“ حضرت علیؑ نے گرج کر کہا:

”لیکن اے دشمنِ خدا میں تجھ سے لڑنا چاہتا ہوں۔“

عمرو اب جوشِ غضب سے بے قرار ہو گیا اور اس نے تلوار کا ایک بھر پور وار حضرت علیؑ پر کیا جس سے ان کی پیشانی زخمی ہو گئی۔ عمرو کے جواب میں حضرت علیؑ نے تلوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ وہ ڈھیر ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی شیرِ خدا نے باوازِ بلند تکبیر کہی۔ اب اس کے ساتھی آگے بڑھے لیکن وہ بھی حضرت علیؑ کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور بھاگ نکلے۔ ان میں سے ایک نوفل بن عبد اللہ مخزومی خندق میں گر پڑا۔ مسلمانوں نے اس کو تیر اور پتھر مار کر ہلاک کرنا چاہتا تو اس نے پکار کر کہا، میں

شریفانہ موت چاہتا ہوں۔ تیروں اور پتھروں سے مجھے مت مارو۔ اس کی بات سن کر حضرت علیؓ خندق میں اترے اور اس کو اپنی تلوار سے قتل کر دیا۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ اہل مکہ نے نوفل کی لاش کے لیے دس ہزار درہم مسلمانوں کو پیش کیے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا:

”لاش دے دو قیمت درکار نہیں۔“

اس واقعہ کے چند دن بعد کفار کی ہمت جواب دے گئی اور وہ مایوسی اور نامرادی کے عالم میں محاصرہ اٹھا کر چلتے بنے۔ ان کے فرار کے بعد حضورؐ یہود بنی قریظہ کی طرف متوجہ ہوئے جو اثنائے محاصرہ میں غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ بقول زرقانیؒ حضورؐ نے اس مہم کا علمبردار حضرت علیؓ کو بنایا۔ انہوں نے بنو قریظہ کے قلعے پر قبضہ کر کے اس کے صحن میں نمازِ عصر ادا کی۔

شعبان ۶ھ میں سرورِ عالم ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنو سعد بن بکر یہود خیبر کو لڑائی کے لیے ابھار رہے ہیں اور خود بھی ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو دو سو سوار دے کر ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے طوفانی یلغار کر کے بنو سعد کو کمر شکن شکست دی اور سو (برولیتِ دیگر پانچ سو) اونٹ اور دو ہزار بکریاں مالِ غنیمت میں لائے۔ یہ مہم ”سریہ فدک“ کے نام سے مشہور ہے۔

ذیقعد ۶ھ میں حضرت علیؓ کو ”بیعتِ رضوان“ میں شریک ہونے کا عظیم الشان شرف حاصل ہوا۔ اس بیعت کے شرکاء کو ”اصحاب الشجرہ“ کہہ کر پکارا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں انہیں اپنی خوشنودی اور جنت کی بشارت دی ہے۔ اسی موقعہ پر صلح نامہ حدیبیہ معرضِ تحریر میں آیا۔ حضورؐ کے حکم کے مطابق اس کی کتابت حضرت علیؓ نے کی۔ ”صلح نامہ“ میں جب ”محمد رسول اللہ“ کے الفاظ آئے تو مشرکین نے اعتراض کیا کہ ہم محمدؐ کو رسول اللہ تسلیم نہیں کرتے اس لیے ”رسول

اللہ“ کا لفظ صلح نامہ میں نہیں آنا چاہئے۔ حضورؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا۔
 ”علی، رسول اللہ کا لفظ عبارت سے محو کر دو۔“

ان کی غیرتِ دینی کو یہ گوارا نہ ہوا، بصد ادب عرض پیرا ہوئے۔ ”یا رسول اللہ
 خدا کی قسم یہ کام مجھ سے نہ ہوگا“۔ حضورؐ نے ان کے جذبات کی قدر فرماتے
 ہوئے خود اپنے دستِ مبارک سے ”رسول اللہ“ کا لفظ مٹا دیا۔ (صحیح بخاری)
 اواخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ میں خیبر پر لشکر کشی ہوئی تو حضرت علیؑ بھی حضورؐ کے
 ہمراہ تھے۔ خیبر میں یہودیوں کے کئی مضبوط قلعے تھے اور قلعے تو جلد فتح ہو گئے
 لیکن حصنِ قموص کسی طرح فتح ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس قلعہ کا حاکم ایک نامور
 یہودی رئیس مرحب نامی تھا جو قوت اور شجاعت میں اپنی مثال آپ تھا۔ جب کئی
 اکابر صحابہؓ کو ”حصن القموص“ مسخر کرنے میں کامیابی نہ ہوئی تو ایک دن شام کے
 وقت حضورؐ نے فرمایا:

”کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح دے گا اور جو
 اللہ اور اللہ کے رسول کو محبوب رکھتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسول اس کو
 محبوب رکھتے ہیں۔“

سب صحابہؓ نے رات اس انتظار میں کاٹی کہ دیکھیں یہ سعادت کس کو نصیب
 ہوتی ہے۔ صبح ہوئی تو حضورؐ نے حضرت علیؑ کو بلا بھیجا۔ وہ اس وقت آشوبِ چشم
 میں مبتلا تھے۔ حضرت سلمہ بن الاکوع انہیں سہارا دے کر حضورؐ کی خدمتِ اقدس
 میں لائے۔ آپؐ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن لگایا، جس سے یہ شکایت
 فوراً دور ہو گئی۔ اب آپؐ نے انہیں علم عطا فرمایا اور حملہ کرنے کا حکم دیا۔ حضرت
 علیؑ نے عرض کی ”یا رسول اللہ کیا یہود کو بزورِ شمشیر مسلمان بنا لوں؟“ حضورؐ نے
 فرمایا۔ ”نہیں ان کو نرمی سے اسلام کی دعوت دو اگر تمہاری تبلیغ سے ایک شخص بھی
 راہِ ہدایت پر آ گیا تو تمہارے لیے بڑی سے بڑی نعمت سے بہتر ہے۔“

حضرت علیؑ نے حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل کی لیکن یہودی لڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کا سردار مرحب سر پر زرد رنگ کا مغفر اور اس پر سنگی خود سجائے یہ رجز پڑھتا ہوا قلعے سے نکلے۔

قَدْ عَلِمْتُ خَيْبَرَ أَنِّي مَرْحَبٌ شَاكِي السَّلَاحِ بَطْلٌ مُجَرَّبٌ
إِذَا الْحُرُوبُ أَقْبَلَتْ تَلَّهَبُ

(خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، ہتھیاروں سے لیس، بہادر اور تجربہ کار ہوں جب لڑائیوں کے شعلے بھڑکتے ہیں)

اس کے مقابلے کے لیے حضرت علیؑ یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

أَنَا الَّذِي سَتَّنِي أُمِّي حَيْدَرَهُ كَلَيْثِ غَابَاتِ كَرِيهِ الْمُنْظَرَهُ
أَوْ فِيهِمْ بِالصَّاعِ كَيْلَ السُّنْدَرَهُ

(میں وہ ہوں جس کا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے، جھاڑیوں کے شیر جیسا ہیبت ناک اور ڈراؤنا، میں دشمنوں کو آن واحد میں ٹھکانے لگا دیتا ہوں)

مرحب نے غضب ناک ہو کر حضرت علیؑ پر حملہ کیا لیکن اللہ کے اس شیر نے اپنی تلوار کے ایک ہی بھر پور وار سے اس کا سر دو ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے بڑھ کر قلعے پر حملہ کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اتفاق سے ان کے ہاتھ سے سپر پھوٹ کر گر پڑی، انہوں نے قلعے کا دروازہ اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں حضرت علیؑ کی محیر العقول شجاعت کی بدولت قلعہ فتح ہو گیا۔

یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد وہ حضورؐ کی خدمت میں واپس آئے تو آپؐ نے خیمے سے باہر نکل کر انہیں اپنے کنارِ شفقت میں لے لیا اور پیشانی چوم کر فرمایا: "رَضِيَ اللَّهُ عَنْكَ وَرَضِيْتُ عَنْكَ" ارشاد نبویؐ سن کر حضرت علیؑ فرط مسرت سے رونے لگے۔

امام محمد بن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، واقدی، امام نووی، حافظ ابن کثیر اور کچھ دوسرے اہل سیر کا بیان ہے کہ مرحب کو حضرت محمد بن مسلمہ انصاری نے قتل کیا لیکن صحیح بخاری (مطبوعہ مصر، جلد ۲ باب غزوة ذی قرد وغیرہ) صحیح مسلم، مسند احمد حنبل، مستدرک حاکم، تاریخ الخلفاء (سیوطی) اور متعدد دوسری کتابوں میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل بیان کیا گیا ہے، اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی نے ”سیرۃ النبیؐ“ میں یہ رائے ظاہر کی ہے:

”ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا۔ مسند احمد حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے لیکن صحیح مسلم (اور حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۹) میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہیں۔“

۸۔ ہجری میں سرورِ عالم ﷺ نے مکہ پر لشکر کشی کا ارادہ فرمایا۔ آپ اہل مکہ کو اپنے عزم سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے، لیکن ایک بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے اس خیال سے اہل مکہ کو حضور کے ارادے سے مطلع کرنا چاہا کہ وہ ان کے ممنون احسان ہو جائیں اور مکہ میں مقیم ان کے اہل و عیال کو کوئی گزند نہ پہنچائیں۔ انہوں نے ایک خط لکھ کر مکہ کی ایک عورت کے حوالے کیا کہ وہ اسے سردارانِ قریش تک پہنچا دے۔ اس کے روانہ ہونے کے بعد حضور کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کو حکم دیا کہ وہ اس عورت کا تعاقب کریں اور اس سے خط چھین کر لائیں۔ یہ تینوں بہادر گھوڑے اڑاتے مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور روضہ خانہ کے مقام پر اس عورت کو جا پکڑا۔ پہلے تو اس نے خط سے لاعلمی ظاہر کی لیکن جب حضرت علیؓ نے اسے جامہ تلاشی کی دھمکی دی تو اس نے اپنے بالوں کے جوڑے سے خط نکال کر انہیں دے دیا۔ وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے حضرت حاطبؓ سے جواب طلبی کی۔

انہوں نے خط بھیجنے کا پس منظر بلا کم و کاست عرض کر دیا۔ حضورؐ نے ان کا عذر قبول فرمایا اور معاملہ رفت گزشت ہو گیا۔

فتح مکہ کے موقع پر حضرت علیؑ ان دس ہزار سرفروشوں میں شامل تھے جن کو رحمتِ عالم ﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا اور جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے ”کتاب استثنا“ میں یوں پیشین گوئی کی گئی تھی:

”خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ کوہِ فاران سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں (یعنی نورانی) شریعت تھی۔“

”مستدرک حاکم“ میں ہے کہ حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد کعبہ میں داخل ہو کر بتوں کو توڑا تو تانبے سے بنا ہوا سب سے بڑا بت رہ گیا۔ کیونکہ یہ لوہے کی ایک سلاخ کے ساتھ زمین سے پیوست تھا۔ حضورؐ نے حضرت علیؑ کے کندھوں پر چڑھ کر اس کو توڑنا چاہا لیکن وہ نہایت قوی الجشہ او شہرور ہونے کے باوجود حضورؐ کے جسم اطہر کا بار سہار نہ سکے۔ اس پر حضورؐ نے انہیں اپنے شانہء اقدس پر چڑھا کر اس بت کو گرانے کا حکم دیا۔ انہوں نے سلاخ اکھاڑ کر اس بت کو گرا دیا۔

فتح مکہ کے بعد غزوہٴ حنین پیش آیا۔ اس میں بنو ہوازن کی بے پناہ تیر اندازی سے مسلمانوں میں انتشار پھیلا تو حضرت علیؑ ان جاں بازوں میں تھے جن کے پائے استقلال میں لمحہ بھر کے لیے بھی لغزش نہ آئی اور جو شروع سے اخیر تک حضورؐ کی ہمرکابی میں دادِ شجاعت دیتے رہے یہاں تک کہ بنو ہوازن خاک چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔

۹۔ ہجری میں حضورؐ نے حضرت علیؑ کو ایک سو پچاس (اور بروایت دیگر صرف پچاس) سوار دے کر بنو طے کی طرف روانہ کیا۔ بنو طے کے سردار عدی بن حاتم طائی شام کی طرف بھاگ گئے۔ دوسرے اہل قبیلہ نے معمولی مزاحمت کے بعد

ہتھیار ڈال دیئے۔ حضرت علیؑ بہت سے قیدی اور کثیر مالِ غنیمت لے کر مدینہ واپس آئے۔ قیدیوں میں سفانہ دخترِ حاتم طائی بھی تھیں، وہ حضورؐ کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئیں۔ آپؐ نے انہیں اور دوسرے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ سفانہؓ نے شام جا کر حضرت عدیؓ کو بھی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے کی ترغیب دی۔ وہ مدینہ آئے اور حضورؐ سے ملاقات کے بعد حلقہٴ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

اسی سال حضورؐ غزوہٴ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت علیؑ کو مدینہ منورہ میں اپنا جانشین بنایا۔ صحیح بخاری میں حضرت مصعب بن سعدؓ سے روایت ہے کہ لشکرِ اسلام کی روانگی کے بعد حضرت علیؑ نے منافقین کے طعنے سُننے تو وہ نہایت تیز رفتاری سے لشکر کے پیچھے روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ لشکر کو پالیا۔ اس وقت طویل سفر اور سخت گرمی کی وجہ سے ان کے پاؤں سوج گئے تھے اور تلوؤں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر شریکِ جہاد ہونے کی اجازت مانگی تو آپؐ نے فرمایا:

”أَلَا تَرْضَىٰ أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِنَزْلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَىٰ إِلَّا أَنَّهُ لَيْسَ نَبِيٌّ بَعْدِي“

(کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ویسے ہو جیسا کہ موسیٰؑ کے لیے ہارون تھے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا)

ارشادِ نبویؐ سن کر حضرت علیؑ نے خوش و خرم مدینہ منورہ کو مراجعت کی۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ تبوک سے واپسی کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیرِ حج بنا کر مکہ روانہ فرمایا۔ اسی اثناء میں سورہٴ برات نازل ہوئی تو آپؐ نے حضرت علیؑ کو یہ ذمہ داری تفویض فرمائی کہ وہ مکہ جا کر حج کے اجتماع میں یہ سورہٴ لوگوں کو سنائیں۔ حضرت علیؑ نے مکہ جا کر یہ سورہٴ لوگوں کو

سنائی اور حضور کے ارشاد کے مطابق اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا، نہ کوئی ننگا ہو کر حج کر سکے گا اور مشرکوں کے ساتھ تمام معاہدے آج سے چار ماہ بعد ختم ہو جائیں گے۔ حجۃ الوداع سے کچھ عرصہ قبل حضور نے حضرت علیؓ کو یمن کے مشہور قبیلہ ہمدان کی طرف داعی اسلام بنا کر روانہ فرمایا۔ ان سے پہلے حضرت خالد بن ولید ان لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے لیکن ان کی مسلسل چھ ماہ کی تبلیغ کے باوجود بنو ہمدان اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حضرت علیؓ یمن گئے تو اس انداز سے لوگوں کو دعوت تو حید دی کہ وہ بلا تا مل حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضور نے حضرت علیؓ کو قاضی بنا کر یمن روانہ فرمایا تھا اور تحصیل خراج کی خدمت بھی ان کے سپرد فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے اور ایک مرتبہ وہاں سے حضور کی خدمت میں کچھ سونا بھی بھیجا جو آپ نے چار (مؤلفۃ القلوب) صحابہؓ میں تقسیم فرما دیا۔

• اھ میں حضرت علیؓ یمن سے آ کر حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ یمن سے حجۃ الوداع میں شرکت کے لیے آئے تو حضور نے ان سے پوچھا، ”اے علیؓ تم نے احرام کس طرح باندھا؟“ انہوں نے عرض کیا، جس طرح نبیؐ نے باندھا ہے۔ فرمایا: ”ہدی بھیجو اور محرم رہو“۔

حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کو ہدی کے اونٹ ہدیہ میں پیش کیے۔

کتاب الحج (بخاری) میں خود حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں کا نگران بنایا۔ میں نے آپ کے حکم سے ان کا گوشت تقسیم کیا، پھر آپ کے حکم سے ان کی جھولیں اور کھالیں تقسیم کیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حجۃ الوداع سے واپسی کے سفر میں حضور نے ”خیم“

نامی ایک تالاب (غدیر) پر قیام فرمایا۔ یہیں تمام صحابہؓ کے سامنے ایک مختصر خطبہ دیا

جس میں دوسرے ارشادات کے علاوہ یہ بھی فرمایا:

”جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔ الہی جو علیؑ سے محبت

رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو علیؑ سے عداوت رکھے تو بھی اس

سے عداوت رکھ۔“

بعض علماء نے ان روایتوں پر تنقید کی ہے لیکن علامہ شبلی نعمانیؒ نے ”سیرۃ النبی“ میں انہیں صحیح تسلیم کیا ہے۔ اگر ”غدیر خم“ والی روایات کی صحت میں کلام بھی کیا جائے تو بھی حضرت علیؑ کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ وہ اصحابِ عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں اور ان کے دوسرے فضائل و مناقب بھی کچھ کم نہیں۔ ان میں سے بیشتر فضائل و مناقب ایسے ہیں کہ ان پر سب مکاتبِ فکر کا اتفاق ہے۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؑ کو تین سو سوار دے کر یمن کے قبیلہ مذحج کی طرف اس ہدایت کے ساتھ روانہ فرمایا کہ طاقت کا استعمال صرف اسی صورت میں کرنا کہ وہ لوگ سرکشی کا مظاہرہ کریں۔ حضرت علیؑ نے یمن پہنچ کر قبیلہ مذحج کو اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے اس کا جواب تیروں اور پتھروں سے دیا۔ ان کی یہ حرکت ناقابل برداشت تھی۔ شیر خدا نے ایک ہی ہلے میں ان کے کس بل نکال دیئے اور وہ اپنے متعدد آدمی مقتول چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ان کے سربر آوردہ آدمی حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت علیؑ مدینہ منورہ واپس آئے تو حضورؐ کی علالت کا آغاز ہو چکا تھا، چند دن بعد آفتابِ رسالت اللہ تعالیٰ کی شفقِ رحمت میں غروب ہو گیا۔ حضرت علیؑ کے لیے یہ جانکاہ صدمہ تھا، لیکن انہوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا۔ مسندِ ابی داؤد میں ہے کہ حضرت علیؑ نے جسدِ اطہر کو غسل دیا اور حضرت عباسؑ، قثم بن عباسؑ، فضل بن عباسؑ اور حضرت اوس بن خولی انصاری نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ غسل

دیتے وقت انہوں نے حضورؐ کے جسدِ اقدس کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ قبر مبارک تیار ہوگئی تو انہوں نے فضل بن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کے ساتھ مل کر جسدِ پاک کو قبر میں اتارا۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ اثنیس (۲۹) برس حیات رہے۔ اس عرصے میں ان کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے جن کی تفصیل کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ اس زمانے کے بعض واقعات اور ان کے اسباب و علل کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی تمام مکاتبِ فکر کے علماء حضرت علیؓ کی عظمت، فضل و کمال اور ان کی پاکیزہ سیرت و کردار کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سریراً رائے خلافت ہوئے تو قطع نظر اس کے کہ حضرت علیؓ نے فوراً ان کی بیعت کر لی یا اس میں چند ماہ توقف کیا، مستند روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات انتہائی خوشگوار تھے اور دونوں ایک دوسرے کا غایت درجہ احترام کرتے تھے۔ علامہ زحشریؒ نے تو اپنی کتاب ”الموافقة بین اہل البیت والصحابة“ میں یہاں تک لکھا ہے کہ حضورؐ کے وصال کے چند ماہ بعد حضرت فاطمہ الزہراءؓ نے وفات پائی تو حضرت علیؓ کے اصرار پر ان کی نماز جنازہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پڑھائی۔ بعض علماء نے اس روایت پر تنقید کی ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ فتنہٴ ردہ کے زمانہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جن صحابہؓ کو مدینہ منورہ کی حفاظت پر مامور فرمایا ان میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے اور انہوں نے یہ خدمت بخوشی انجام دی۔

حضرت علیؓ کے دل میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کس قدر محبت اور عظمت تھی، اس کا اندازہ اس خطبہ سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد اس مکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر دیا جس میں صدیق اکبرؓ کی میت رکھی

ہوئی تھی۔ علامہ محبت الدین طبری نے اپنی کتاب ”الریاض النضرہ“ میں یہ پورا خطبہ نقل کیا ہے اس کے چند حصے ملاحظہ ہوں۔

”اے ابوبکر تم پر اللہ کی رحمت، تم رسول اللہ ﷺ کے محبوب، مونس، معتمد اور مشیر تھے۔ تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے اور سب سے بڑھ کر دین کو نفع پہنچانے والے تھے۔ تم نے آپ کے ساتھ اس وقت غمخواری کی جب اوروں نے تنگ دلی دکھائی۔ جب لوگ مصائب کی وجہ سے دل شکستہ ہو رہے تھے تم آپ کی مدد پر قائم رہے۔ تم دو میں سے ایک تھے اور غار میں رفیق۔ تمہاری آواز سب سے دھیمی، تمہارا کلام سب سے زیادہ باوقار، تمہاری گفتگو سب سے زیادہ باصواب، تمہاری خاموشی سب سے زیادہ طویل اور تمہارا قول سب سے زیادہ بلیغ تھا۔ تم رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر اس وقت بھی قائم رہے جب لوگ مضطرب ہو گئے۔ تم کافروں کے لیے عذاب اور قہر تھے اور مومنوں کے لیے سراپا رحمت۔ تم اس پہاڑ کی مثل تھے جس کو نہ شدائد ہلا سکتے ہیں اور نہ ہوا کے طوفان ہٹا سکتے ہیں۔ عاجز اور درماندہ تمہارے نزدیک قوی اور معزز تھا کہ تم اس کا حق دلا کر چھوڑتے تھے اور زبردست تمہارے نزدیک کمزور اور ناچیز تھا کہ تم اس سے دوسروں کا چھینا ہوا حق لے کر رہتے تھے۔ واللہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تمہاری وفات سے بڑھ کر مسلمانوں پر کوئی مصیبت نہیں پڑے گی۔ تم دین کی عزت حفاظت اور پناہ تھے۔ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے نبی سے ملا دے اور ہم کو تمہارے اجر سے محروم اور تمہارے بعد گمراہ نہ فرمائے۔“

حضرت علیؑ کا خطبہ ختم ہوا تو لوگ بے اختیار رونے لگے۔ چند ماہ بعد حضرت

علیؑ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیوہ حضرت اسماء بنت عمیس سے نکاح کر لیا اور ان کے بطن سے حضرت ابوبکرؓ کے فرزند محمد بن ابی بکر کی نہایت محبت اور شفقت سے پرورش کی۔ حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے حضرت علیؑ کو اپنا مشیر خاص بنایا۔ دونوں میں اس قدر محبت و یگانگت تھی کہ تمام کام باہمی مشورے سے کرتے تھے۔

۱۶ھ میں حضرت عمرؓ بیت المقدس گئے تو حضرت علیؑ کو مدینہ منورہ میں اپنا جانشین اور قائم مقام بنایا۔ اپنی وفات سے پہلے انہوں نے جن چھ اصحاب کو خلافت کے لیے نامزد فرمایا ان میں حضرت علیؑ بھی شامل تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنی لختِ جگر اُمّ کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کر دیا تھا۔ (ابن جریر طبری، ابن حبان، ابن قتیبہ، ابن اثیر)

حضرت عمرؓ نے وفات پائی تو حضرت علیؑ بادیۃ نم ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کا جنازہ تابوت میں رکھا گیا کہ ایک شخص نے میرے پیچھے سے آکر اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور کہا، عمر خدا تمہارے حال پر رحم کرے، میرا یہی خیال تھا کہ اللہ تم کو تمہارے دونوں ساتھیوں کے ساتھ رکھے گا اس لیے کہ کئی بار میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ ”میں ابوبکر اور عمر۔ یا میں ابوبکر اور عمر نے یہ کام کیا یا فلاں جگہ گئے“۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علیؑ تھے۔

حضرت عثمانؓ ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں بھی حضرت علیؑ ان کو مخلصانہ مشورے دیتے رہے۔ ان بزرگوں کے ساتھ حضرت علیؑ کے تعلقِ خاطر کی یہ کیفیت تھی کہ انہوں نے اپنے تین صاحبزادوں کے نام ابوبکر، عمر اور عثمان رکھے۔ ابوبکر (جو لیلیٰ بنت مسعود کے بطن سے تھے) اور عثمان (جو ام البنین کے بطن سے تھے) سیدنا حسینؓ کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے۔ عمر نے پچاس برس کی عمر میں

نبیوع میں وفات پائی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو (کچھ دوسرے جوانانِ قریش کے ساتھ) ان کی حفاظت پر مامور فرمایا لیکن باغی دوسری طرف سے دیوار پھاند کر مکان کے اندر گھس گئے اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی شہادت کا واقعہ ہائلہ پیش آیا۔

۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی لیکن انہوں نے تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور خلافتِ راشدہ کی کشتی کو گردابِ بلا سے نکالنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی مرحوم نے اپنی کتاب ”قولِ سدید“ میں امیر المؤمنین حضرت علیؓ کی استقامت اور شانِ جہانبانی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

”اتنی زبردست مشکلات میں گھرے ہونے پر دوسرا شخص شاید اوسان کھو بیٹھتا مگر اللہ رے عزم و استقامت، یہ دن کا شہسوار اور رات کا راہب ایک طرف فوجوں کی کمان کر رہا ہے دوسری طرف محرابِ عبادت میں بہ کمالِ خضوع سجدہ ریز ہے۔ کبھی دارالعدالت میں مشکل مقدمات کے فیصلے سنا رہا ہے اور کبھی مسجدِ رحبہ (کوفہ) میں مواعظ و حکم کے موتی لٹا رہا ہے۔“

حضرت علیؓ نے مسندِ خلافت پر قدم رکھا تو سب سے پہلے ان کو ”خونِ عثمانؓ“ کے قصاص کا معاملہ پیش آیا۔ شریعت کے مطابق ارتکابِ جرم کے ثبوت میں ایسے معتبر گواہوں کا ہونا لازمی ہے جنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے مجرموں کو قتل کرتے دیکھا ہو۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت صرف ان کی اہلیہ حضرت نائلہؓ ان کے پاس موجود تھیں، وہ صرف یہ بتا سکیں کہ تین آدمی اندر آئے جن میں سے ایک محمد بن ابی بکرؓ تھے۔ حضرت علیؓ نے انہیں پکڑ کر پوچھا تو انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ

وہ قتل کے ارادے سے کا شانہء خلافت میں ضرور داخل ہوئے تھے لیکن جب حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ ”بھتیجے تمہارے باپ زندہ ہوتے تو ان کو تمہاری یہ حرکت پسند نہ آتی“ تو وہ شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ آئے۔ دوسرے دو آدمیوں کو وہ بھی نہیں جانتے۔ غرض تحقیق و تفتیش کے باوجود اصل قاتلوں کا پتہ نہ چل سکا اور حضرت علیؓ اسلام کے قانون شہادت کے مطابق کسی پر حد شرعی جاری نہ کر سکے۔ یہ بات البتہ درست ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش میں حصہ لیا تھا بہت بڑی تعداد میں حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے لیکن حالات نے اتنی تیزی سے کروٹ لی کہ حضرت والاؓ کو تطہیر لشکر کی مہلت ہی نہ ملی اور بعض اصحاب انہیں ”خون عثمانؓ“ میں شریک جاننے لگے۔ اسی غلط فہمی کے نتیجے میں ”جمل“ کی افسوسناک لڑائی پیش آئی۔ اس کا فیصلہ حضرت علیؓ کے حق میں ہوا تو انہوں نے عام اعلان کر دیا کہ نہ مالِ غنیمت لوٹا جائے، نہ بھاگنے والوں کا تعاقب کیا جائے اور نہ کسی ہتھیار ڈالنے والے سے تعرض کیا جائے۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی مزاج پُرسی کی اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ انہیں مدینہ منورہ بھیج دیا۔

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ کے دورِ خلافت کا بہت سا وقت امیر معاویہؓ کے ساتھ لڑائیوں میں صرف ہوا۔ ان لڑائیوں میں حضرت علیؓ کا طرزِ عمل کیا تھا؟ اس کا اندازہ ابنِ اثیرؒ کے اس بیان سے کیا جاتا ہے کہ ایک موقع پر شامی فوج نے دریا کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؓ کی فوج کو پانی لینے سے روک دیا، لیکن جب علوی فوج نے شامیوں کو پیچھے دھکیل کر گھاٹ پر قبضہ لیا تو حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ شامیوں کو پانی لینے سے ہرگز نہ روکا جائے۔ صفتین کے مقام پر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی فوجوں کے درمیان عرصہ تک خونریز جھڑپیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ واقعہ تحکیم پیش آیا۔ اس کے نتیجے میں امن تو قائم ہو گیا لیکن خوارج کا فرقہ

پیدا ہو گیا جو حضرت علیؑ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ، سب کا دشمن تھا۔ حضرت علیؑ نے شروع شروع میں ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کی تکفیر اور فساد برپا کرنا شروع کر دیا تو حضرت علیؑ نے پوری قوت سے ان کی سرکوبی کی اور نہروان کی لڑائی میں انہیں عبرتناک شکست دے کر ان کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس گروہ (خوارج) کو جمہور صحابہ کرامؓ واجب القتل سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ انہیں بدترین مخلوق سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان لوگوں نے قرآن کی وہ آیات جو کفار کے لیے نازل ہوئیں، مسلمانوں پر منطبق کر دیں۔

بعض لوگ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے سلسلے میں حضرت علیؑ پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں، ان کو سیاست سے نابلد قرار دیتے ہیں اور ان کی عظمت و مرتبہ کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے عہد کے ایک نامور عالم اور مصنف مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے نہایت بلیغ انداز میں ان لوگوں کی روش پر اس طرح خامہ فرسائی کی ہے:

”باوجود دیکھنے کے جو نہیں دیکھنا چاہتے ان کو کیسے دکھایا جاسکتا ہے۔ حضرت علیؑ پر تنقید کرنے والوں کی طرف سے جب اس قسم کی باتیں میرے کانوں میں پہنچتی ہیں تو ہمیشہ دل میں یہ خیال آتا ہے کہ علیؑ کی پچھلی زندگی پر تنقید کرنے والے ان کی زندگی کی ابتدائی خدمات سے اپنے آپ کو اندھا کیوں بنا لیتے ہیں، وہ اسلامی اٹلس میں ایران و مصر و شام و عراق کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قادیسہ میں جو کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوئی کیا بدر کی فیصلہ گن کامیابی کے بغیر نصیب ہو سکتی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہیں کہ یرموک ندی کے ساحل پر معجزانہ شکست ان کے دشمنوں کو اٹھانا پڑی لیکن یرموک کی خوشی پر

شادیا نے بجانے والوں سے کوئی پوچھے کہ ارے محسن کشو! یرموک تک تم پہنچ بھی سکتے تھے اگر کھولنے والا تم پر خیبر کے پہاڑی قلعوں کے دروازوں کو نہ کھول دیتا۔“

اندرونی شورشوں کی وجہ سے اگرچہ حضرت علیؑ اسلامی فتوحات کے دائرہ کو زیادہ وسیع نہ کر سکے پھر بھی وہ اس طرف سے غافل نہ رہے، کرمان و فارس کی بغاوتیں فروکیں، کابل و سیستان پر اسلامی قبضہ مستحکم کیا اور مسلمانوں کو بحری راستے سے ہندوستان کی طرف پیشقدمی کی اجازت دی۔ انہوں نے ملک کا نظم و نسق بھی ایسے احسن طریقے سے چلایا جو ایک ”خلیفہ راشد“ ہی کے شایان شان ہو سکتا تھا۔ ان کے عظیم کردار اور شانِ جہانبانی کا اندازہ اس تصویر سے کیا جاسکتا ہے جو ان کے ایک رفیق قدیم ضرار بن ضمیرہ اسدی نے امیر معاویہؓ کے دربار میں کھینچی۔ امیر معاویہؓ نے ضرار اسدی سے حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ان کے خصائل اور معمولات کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا:

”بڑے بلند نظر، بڑے عالی ہمت، بڑے طاقتور، جچی تلی گفتگو فرماتے حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کرتے۔ زبان و دہن سے علم کا چشمہ اُبلتا، ہر ہر ادا سے حکمت نپکتی۔ دنیا اور بہارِ دنیا سے وحشت تھی۔ رات اور رات کی تاریکی میں خوش رہتے۔ آنکھیں پر آب، ہر وقت فکر و غم میں ڈوبے ہوئے، رفتارِ زمانہ پر متعجب، نفس سے ہر وقت مخاطب، کپڑا وہ مرغوب تھا جو معمولی اور موٹا جھوٹا ہو۔ غذا وہ مرغوب تھی جو غریبانہ اور سادہ ہو۔ کوئی امتیازی نشان پسند نہیں کرتے تھے۔ جماعت کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔ ہم سوال کرتے تو جواب دیتے تھے۔ ہم حاضر ہوتے تو سلام اور مزاجِ پُرسی میں پہل کرتے۔ ہم مدعو کرتے تو دعوت قبول فرماتے، لیکن اس قرب و مساوات کے پاؤں جو درعب کا یہ

عالم تھا کہ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی اور سلسلہء سخن کا آغاز کرنا مشکل ہوتا۔ اگر کبھی مسکراتے تو دانت موتی کی لڑی معلوم ہوتے۔ دینداروں کی عزت اور مسکین سے محبت کرتے تھے لیکن اس تواضع اور مسکنت کے باوجود کسی طاقتور اور دولت مند کی یہ مجال نہ تھی کہ ان سے غلط فیصلہ کروالے یا ان سے کوئی رعایت حاصل کرے اور کمزور کو ہر وقت ان کے عدل و انصاف کا بھروسا تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک شب ان کو ایسی حالت میں دیکھا کہ رات نے اپنی ظلمت کے پردے ڈال دیئے تھے اور ستارے ڈھل چلے تھے، آپ اپنی مسجد کے محراب میں کھڑے تھے۔ ڈاڑھی مٹھی میں تھی۔ اس طرح تڑپ رہے تھے جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اس طرح رو رہے تھے جیسے دل پر کوئی چوٹ لگی ہو۔ اس وقت میرے کانوں میں ان کے الفاظ گونج رہے ہیں، اے دنیا، اے دنیا کیا تو میرا امتحان لینے چلی ہے اور مجھے بہکانے کی ہمت ہے، مایوس ہو جا، کسی اور کو فریب دے، میں نے تو تجھے ایسی تین طلاقیں دی ہیں جن کے بعد رجعت کا کوئی سوال نہیں، تیری عمر کوتاہ، تیرا عیش بے حقیقت، تیرا خطرہ زبردست، ہائے زاوراہ کس قدر کم ہے، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک ہے۔“

ضرار کی یہ تقریر سن کر امیر معاویہؓ رونے لگے اور کہا، ”خدا ابوالحسن پر رحم کرے۔ واللہ وہ ایسے ہی تھے۔“ پھر امیر معاویہؓ نے ان سے پوچھا، ”اے ضرار تم کو ان کا کتنا غم ہے؟“ انہوں نے کہا ”جتنا اس عورت کو ہو جس کا اکلوتا بیٹا اس کی گود میں ذبح کر دیا گیا ہو۔“

حضرت علیؓ کے دورِ خلافت کے چند واقعات ملاحظہ ہوں:

امیر المؤمنینؑ کے بھائی حضرت عقیلؑ بن ابی طالب کو روپے کی ضرورت تھی۔ انہوں نے حضرت علیؑ کے سامنے اپنی ضرورت بیان کی، فرمایا تم جانتے ہو میرے پاس روپیہ کہاں، بولے بیت المال سے قرض دلوادیتجئے۔ ارشاد ہوا ”میں اللہ کے سامنے چور بننا نہیں چاہتا۔ اس معاملہ میں تم، حسنؑ اور عام آدمی میرے لیے برابر ہیں۔“ حضرت والا کے فقر و زہد اور احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عقیلؑ ان کا ساتھ چھوڑ کر امیر معاویہؓ کے پاس چلے گئے۔

ایک دفعہ عبداللہ بن زری نامی ایک صاحب شریک طعام ہوئے۔ دسترخوان پر نہایت سادہ کھانا تھا۔ انہوں نے عرض کیا ”امیر المؤمنین آپ کو پرندوں کے گوشت کا شوق نہیں؟“ فرمایا: ”ابن زری! خلیفہ وقت کو مسلمانوں کے مال میں صرف دو پیالوں کا حق ہے، ایک خود کھائے اور کھلائے اور دوسرا عامۃ الناس کے سامنے پیش کرے۔“ (ازالۃ الحفاء) ایک دفعہ اصفہان سے مال آیا تو انہوں نے اس کے سات حصے کیے۔ اس میں ایک روٹی بھی تھی، اس کے بھی سات ٹکڑے کیے اور ہر حصے پر ایک ایک ٹکڑا تقسیم کیا، پھر قرعہ ڈال کر تمام حصے تقسیم کیے۔

ایک دفعہ اپنے غلام قنبر کو ساتھ لے کر کپڑا خریدنے تشریف لے گئے۔ اپنے لیے معمولی موٹا کپڑا اور قنبر کے لیے اچھا ملائم کپڑا انتخاب کیا۔ قنبر نے تا مل کیا تو فرمایا ”تم جوان ہو تمہارے لیے اچھا کپڑا مناسب ہے، میرا کیا ہے بوڑھا آدمی ہوں۔“

ایک مرتبہ عید سے پہلے لوگوں نے عرض کیا ”امیر المؤمنین آپ کے لباس میں پیوند لگے ہوئے ہیں۔ اگر آپ دو درہم میں کپڑوں کا ایک جوڑا خرید لیں اور عید کے دن اسے پہن لیں تو کیا اچھا ہو؟“ فرمایا، ”مجھے شرم آتی ہے کہ میں نئے کپڑے پہنوں اور کوفہ میں ہزاروں اشخاص بوسیدہ لباس میں ہوں۔“

ایک دفعہ بیت المال میں جو کچھ تھا، امیر المؤمنین نے اس کو مسلمانوں میں

تقسیم کر دیا اور اس میں جھاڑو دے کر دو رکعت نماز پڑھی۔ نماز کے بعد فرمایا:
 ”اے زمین تو گواہ رہ کہ میں نے مسلمانوں کی امانت ادا کر دی۔“

ایک مرتبہ منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا ”کون میری یہ تلوار خریدتا ہے، خدا کی قسم اگر میرے پاس ایک تہبند کی قیمت ہوتی تو اس کو فروخت نہ کرتا۔“ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا، ”امیر المؤمنین میں تہبند کی قیمت قرض دیتا ہوں۔“

ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ ایامِ خلافت میں امیر المؤمنین علیؑ چھوٹی آستین اونچے دامن کا کرتہ اور معمولی تہبند باندھے بازار میں گشت کرتے پھرتے۔ اگر کوئی تعظیماً پیچھے ہو لیتا تو اس کو ہٹا دیتے اور فرماتے ”اس میں حاکم کے لیے فتنہ اور مومن کے لیے ذلت ہے۔“

جب کہیں سے مال آتا تو سارے کا سارا مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ نہ اپنے لیے کوئی خاص چیز منتخب کرتے اور نہ تقسیم میں اپنے اعزہ و اقربا کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں سے نارنگیاں آئیں، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ نے ایک ایک نارنگی اٹھالی۔ امیر المؤمنینؑ نے نارنگیاں ان سے چھین لیں اور لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے جب دار الخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کیا تو دارالامارت کے بجائے ایک میدان میں خیمہ لگا کر اس میں قیام کیا اور فرمایا۔ عمر بن الخطاب نے ہمیشہ ہی ان عالی شان محلوں کو نظرِ حقارت سے دیکھا مجھے بھی ان کی حاجت نہیں۔ بعد میں ایک معمولی مکان کو اپنا مسکن بنایا۔ دروازے پر نہ کوئی حاجب تھا اور نہ کوئی دربان۔ ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

ابن ابی رافع سے روایت ہے کہ میں امیر المؤمنین علیؑ بن ابی طالب کے بیت المال کا نگران تھا۔ ایک مرتبہ بصرہ سے موتیوں کا ایک ہار آیا۔ امیر المؤمنینؑ

کی صاحبزادی نے یہ ہار مجھ سے عاریتاً مانگ بھیجا کہ وہ اسے عید کے دن پہن کر واپس کر دیں گی۔ میں نے یہ ہار انہیں بھیج دیا۔ امیر المؤمنین کی نظر اس ہار پر پڑی تو انہوں نے بیٹی سے پوچھا ”یہ کہاں سے آیا ہے؟“ انہوں نے واقعہ بیان کیا تو امیر المؤمنین نے مجھ سے فرمایا، ابن ابی رافع تم خیانت بھی کرنے لگے؟ میں نے عرض کیا، معاذ اللہ، فرمایا، تم نے میری بیٹی کو بیت المال کا ہار عاریتاً کیسے دے دیا نہ مجھ سے اجازت لی، نہ مسلمانوں سے۔ میں نے عرض کیا، وہ آپ کی صاحبزادی ہیں انہوں نے ایک چیز مانگی اور میں نے تین دن بعد صحیح و سالم واپسی کی شرط پر انہیں دے دی۔ ارشاد ہوا ابھی واپس لو۔ اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو سزا سے نہیں بچ سکو گے۔ میری بیٹی نے یہ ہار عاریتاً نہ منگایا ہوتا تو یہ پہلی ہاشمی لڑکی ہوتی جس کے ہاتھ میں چوری کے الزام میں قطع کراتا۔“

امیر المؤمنین کی صاحبزادی نے عرض کی ”امیر المؤمنین میں آپ کی بیٹی ہوں، مجھ سے زیادہ اس ہار کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟“ فرمایا، ”اے ابن ابی طالب کی بیٹی کیا مہاجرین اور انصار کی تمام لڑکیاں عید پر ایسا ہار پہنیں گی؟“ وہ خاموش ہو گئیں اور میں نے ہار ان سے لے کر بیت المال میں رکھ دیا۔

حضرت علیؑ کے دورِ خلافت کے ایسے اور بھی بہت سے واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں جو ان کی عظمتِ کردار پر دال ہیں۔ سیدنا علیؑ کی ذاتِ گرامی صرف زہدنی الدنیا ہی کا نمونہ نہیں تھی بلکہ وہ عدل و انصاف اور عتعال کا محاسبہ کرنے میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ عتعال کو ہمیشہ تقویٰ، نرمی اور عدل سے کام لینے کی تلقین فرماتے اور ان کی معمولی سی بدعنوانی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ رعایا پر نہایت شفیق تھے اور عدل و انصاف میں مطلق کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے ”تاریخ الخلفاء“ میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ جنگِ صفین میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوئے تو زہرہ باوجود تلاش کرنے کے نہ ملی۔ جنگ سے

واپس آئے تو وہ زرہ ایک یہودی کے پاس نکلی۔ انہوں نے یہودی سے فرمایا، ”نہ میں نے زرہ کسی کو دی، نہ کسی کے ہاتھ نیچی پھر یہ تیرے پاس کیسے آگئی؟ اس نے کہا، میں کچھ نہیں جانتا یہ زرہ میرے قبضے میں ہے اور میری ہے۔ حضرت علیؓ خلیفہ وقت تھے، چاہتے تو زرہ بزور اس سے لے سکتے تھے لیکن وہ یہ معاملہ قاضی شریح کی عدالت میں لے گئے۔ قاضی صاحب نے امیر المؤمنین کا دعویٰ اور یہودی کا جواب سن کر حضرت والاؓ سے فرمایا، اپنے گواہ لائیے۔ انہوں نے فرمایا، میرا بیٹا حسنؓ اور غلام قنبر موجود ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا، بیٹے کی باپ کے لیے اور غلام کی آقا کے لیے شہادت قبول نہیں کی جاسکتی۔ فرمایا تعجب ہے کہ آپ اہل جنت کی شہادت قبول نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حسنؓ اور حسینؓ جو انانِ جنت کے سردار ہیں لیکن شریح اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اس پر یہودی یکا یک چلا اٹھا، آپ خلیفہ وقت ہیں لیکن قاضی صاحب آپ پر عام آدمیوں کی طرح جرح کر رہے ہیں۔ بے شک آپ کا دین سچا ہے اور یہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کلمہ پڑھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

۷۔ رمضان المبارک ۴۰ھ کو ایک خارجی عبدالرحمن بن مجمل نے عین اس وقت امیر المؤمنین پر زہر آلود تلوار سے قاتلانہ حملہ کیا جب وہ نماز پڑھ رہے تھے اور رب العزت کے حضور سر بسجود تھے۔ قاتل گرفتار ہو گیا تو آپؐ نے اپنے صاحبزادوں سے فرمایا، اس کا قتل اس وقت تک ملتوی رکھو جب تک کہ میں مرنہ جاؤں۔ امام احمد بن حنبل نے آپؐ سے یہ الفاظ منسوب کیے ہیں کہ اگر میں مرجاؤں تو اس کو قتل کر دینا اور اگر میں بچ گیا تو صرف زخم کا بدلہ لیا جائے گا۔ علامہ محبت الدین طبری نے ”الریاض النضرہ“ میں لکھا ہے کہ آپ نے فرمایا، ”جان کا بدلہ جان ہے اگر میں مر گیا تو اس کو مار ڈالنا، اگر زندہ رہا تو اس کی نسبت خود فیصلہ کروں گا۔ خبردار بجز میرے قاتل کے کسی کو نہ مارنا۔ اے بنی مُطَلَب میں مسلمانوں کا خون نہیں کرانا

چاہتا۔ اے حسن آگاہ رہو کہ میرے قاتل کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے بچو اگرچہ وہ کھٹکتا کتا ہی کیوں نہ ہو۔
۲۰۔ رمضان المبارک (جمعہ) ۴۰ھ کی شب کو اسلام کا یہ مہر عالم افروز ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل و مناقب اور عظمتِ کردار کی تفصیل بیان کرنے کے لیے پورا دفتر درکار ہے یہاں ہم ان کی حیاتِ طیّہ کے چند خاص پہلوؤں پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔

- ۱۔ سیدنا حضرت علیؑ کی کفالت اور تربیت خود سید المرسلینؐ نے فرمائی اور بارگاہِ رسالت میں انہیں ہمیشہ درجہء تقرب و اختصاص حاصل رہا۔
- ۲۔ ان کو بچپن میں ہی قبولِ ایمان کی سعادت نصیب ہوئی اور انہوں نے ”سابقون الاولون“ میں بھی خاص درجہ حاصل کیا۔
- ۳۔ وہ زندگی کے کسی دور میں بُت پرستی، شراب نوشی یا کسی اور فبیح حرکت میں ملوث نہیں ہوئے۔
- ۴۔ انہوں نے سب سے پہلے سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔
- ۵۔ ہر معرکہ میں اپنی شجاعت و بسالت اور فداکاری کا لوہا منوایا اور راہِ حق میں کبھی اپنی جان کی پروا نہ کی۔ بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین کے بطلِ خاص ہوئے اور اسد اللہ الغالب کے لقب کے مستحق ٹھہرے۔
- ۶۔ مکہ میں ساہا سال تک سرورِ عالم ﷺ کے ساتھ ہر قسم کے مصائب جھیلتے رہے۔ شبِ ہجرت حضورؐ کے بستر مبارک پر سوئے۔
- ۷۔ خیر البشرؐ نے انہیں اپنا مواخاتی بھائی بنایا۔ چند سال بعد ان کو اپنے ساتھ وہی نسبت دی جو حضرت موسیٰؑ کو حضرت ہارونؑ سے تھی۔

۸- وہ اصحاب بدر میں سے ایک ہیں جن کی تمام خطائیں اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیں۔

۹- وہ سابقون الاولون میں سے بھی ہیں اور مہاجرین سے بھی اور ان سب کو اللہ تعالیٰ نے جنتی قرار دیا ہے۔

۱۰- وہ بیعت رضوان میں شریک ہوئے اور ”اصحاب الشجرہ“ کی جماعت میں شامل ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اپنے راضی ہونے کی خبر دی۔

۱۱- وہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔

۱۲- رسول اللہ ﷺ کا علم ہر جنگ میں ان کے پاس رہا۔

۱۳- خود ذات رسالت مآب نے انہیں ابو تراب کی کنیت عطا فرمائی۔ صحیح بخاری میں حضرت سہیل بن سعد سے روایت ہے ”رسول اللہ ﷺ فاطمہ کے مکان میں آئے اور علیؑ کو نہیں پایا، پوچھا، تمہارے ابن عم کہاں ہیں۔ بولیں مجھ میں اور ان میں کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی، وہ غصہ میں چلے گئے ہیں اور یہاں (دوپہر کو) نہیں لیٹے۔ رسول اللہ نے ایک شخص سے فرمایا، دیکھو، وہ کہاں ہیں؟ اس نے آ کر خبر دی کہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے۔ وہ لیٹے ہوئے تھے۔ پہلو سے چادر ہٹ گئی تھی اور مٹی جسم میں لگ گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ مٹی پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے ”ابو تراب (مٹی کے باپ) اٹھو ابو تراب اٹھو“ یہ کنیت حضرت علیؑ کو اس قدر پیاری تھی کہ جب کوئی اس سے مخاطب کرتا تو بے حد خوش ہوتے۔

۱۴- وہ ان چار مقدس ہستیوں میں سے ایک ہیں جن پر حضرت عائشہ صدیقہ کے قول کے مطابق حضور نے ایک کپڑا ڈال کر دعا فرمائی: ”اللَّهُمَّ هُوَ لِأَهْلِ بَيْتِي فَادْهَبْ عَنْهُمْ الرَّجْسَ وَطَهِّرْهُمْ تَطْهِيرًا.“ (الہی یہ میرے اہل

بیت ہیں ان سے گندگی کو دور رکھ اور انہیں پاک کر دے) اس موقع پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ میں بھی تو آپ کے اہل بیت میں سے ہوں“۔ حضورؐ نے فرمایا ”تم الگ رہو، تم تو خیر ہو ہی“۔ (صحیح مسلم، مسند احمد، مسند بیہقی، مستدرک حاکم وغیرہ) یہ چار نفوس حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ الزہراءؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ تھے۔

۱۵- وہ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہراءؓ بتولؓ کے زوج ہیں۔ ان کا نکاح خود حضورؐ نے سیدہ سے پڑھایا اور ان دونوں کو دعائے خیر و برکت دی۔

۱۶- وہ کاتب وحی تھے۔ صلح نامہ حدیبیہ بھی انہوں نے ہی تحریر کیا۔ اس میں سے ”رسول اللہ“ کا لفظ محو کرنا گوارا نہ کیا۔ حضورؐ کے کئی مکاتیب و فرامین بھی انہوں نے تحریر کیے۔

۱۷- اُن سے بغض رکھنے کو سرورِ کائناتؐ نے محرومی کا سبب بتایا۔

۱۸- ان کو خود حضورؐ نے یمن کا قاضی، مبلغ اور حاکم مقرر فرمایا۔

۱۹- وہ بے حد عبادت گزار تھے۔ امام حاکمؒ نے زبیر بن سعید سے روایت کی ہے کہ میں نے کسی ہاشمی کو نہیں دیکھا جو ان سے زیادہ عبادت گزار ہو۔ ترمذی کتاب المناقب میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ علیؓ بڑے روزہ دار اور عبادت گزار تھے۔

۲۰- ان کی ذات فقر و زہد سے عبارت تھی۔ تمام عمر فقر و فاقہ میں گزاری۔ عہد

رسالت میں ان کی زوجہ محترمہ حضرت فاطمہ الزہراءؓ اپنے ہاتھوں سے چکی

پیساکرتی تھیں اور حضرت علیؓ خود پانی ڈھو کر لایا کرتے تھے۔ قوتِ لایموت

کے لیے مزدوری سے بھی عار نہیں کرتے تھے۔ کئی مرتبہ کھجوروں کی اجرت پر

مزدوری کی۔ لباس، خوراک، رہن سہن، ہر بات میں کمال درجے کی سادگی

تھی۔

۲۱- بے حد سخی اور ایثار پیشہ تھے۔ کوئی سائل اور حاجت مند ان کے در سے خالی نہ جاتا تھا۔ صبح بخاری میں ہے ایک مرتبہ رات بھر کسی کا باغ سینچتے رہے۔ صبح کے وقت تھوڑے سے جو مزدوری میں ملے۔ وہ لے کر گھر آئے حضرت فاطمہؓ نے ان میں سے ایک تہائی پکائے ہی تھے کہ ایک مسکین نے صدا دی۔ حضرت علیؓ نے سارا کھانا اٹھا کر اس کو دے دیا۔ حضرت فاطمہؓ نے دوسرا ٹلٹ تیار کیا تو ایک نادار یتیم نے آکر سوال کیا۔ حضرت علیؓ نے یہ کھانا بھی اس کو دے دیا۔ حضرت فاطمہؓ نے باقی جو پکائے تو ایک قیدی دروازے پر آگیا حضرت علیؓ نے یہ بھی اس کو دے دیئے اور یوں سارا گھر فاقہ سے رہا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ سورۃ الدھر کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا۔ (اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

(خلفائے راشدین از شاہ معین الدین مرحوم ترجمہ: حضرت علیؓ)

۲۲- وہ علم و فضل کے اعتبار سے نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔ اگرچہ حدیث ”میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے“۔ بعض علماء کے نزدیک ضعیف ہے۔ لیکن اس کے باوجود تمام علماء و محققین حضرت علیؓ کی جلالت علمی اور تفقہ فی الدین کے معترف ہیں۔ فی الحقیقت وہ تمام علوم دینی کا بحر زخار تھے اور یہ ان کی زندگی کا نہایت ہی درخشاں پہلو ہے۔ علم کی نشر و اشاعت، امامت و اجتہاد اور فضل و کمال میں وہ خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے تفقہ فی الدین اور اصابت رائے پر دوسرے صحابہ رشک کیا کرتے تھے۔ خود حضورؐ نے انہیں عہدہ قضا پر مامور فرمایا۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے علیؓ ہم میں سب سے بڑے قاضی ہیں۔ کتب حدیث و سیر میں ان کی فتاہت اور فصلی مقدمات کے بے شمار واقعات ملتے ہیں جن کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

انہیں غیر معمولی دانش و حکمت عطا فرمائی تھی۔

وہ قرآن حکیم کے حافظ تھے اور اس کی ایک ایک آیت کے معنی اور شانِ نزول سے واقف تھے، گویا تفسیر قرآن میں وہ مرتبہ کمال پر تھے۔ خود ان کا اپنا قول ہے ”مگر وہ فہم جو خدا کسی کو قرآن میں دے وہ میرے پاس ہے۔“ حدیث میں بھی وہ ارشاداتِ نبوی کے بہت بڑے عالم تھے، ان سے ۵۸۶ حدیثیں مروی ہیں۔ تقریر و خطابت میں اپنی مثال آپ تھے۔ مختلف کتابوں میں ان کے جو خطبے ملتے ہیں انہیں پڑھ کر لامحالہ شیرِ خدا کے زورِ بیان اور تبحرِ علمی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

سیدنا علیؑ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ اربابِ سیر نے ان کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں جو حسنِ تخیل اور خوبیء بیان کا مظہر ہیں۔ فنِ نحو کی ایجاد کا سہرا بھی حضرت علیؑ کے سر ہے۔ یہ حضرت علیؑ کے علم و فضل کے بارے میں محض چند اشارے ہیں ورنہ:

”سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے۔“



سیدۃ النساءؓ کی خوشدامن

حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد

ہجرتِ نبویؐ کے چار پانچ سال بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک اندوہناک خبر سن کر سخت ملول و محزون ہو گئے اور آپؐ کی چشم ہائے مقدّس سے سیلِ اشک رواں ہو گیا۔ یہ ایک خاتون کی وفات کی خبر تھی۔ آپؐ فوراً میت والے گھر تشریف لے گئے اور ابدی نیند سونے والی خاتون کے سر ہانے کھڑے ہو کر فرمایا:

”اے میری ماں خدا آپ پر رحم کرے۔ آپ میری ماں کے بعد ماں تھیں، آپ خود بھوکی رہتی تھیں، مگر مجھے کھلاتی تھیں، آپ کو خود لباس کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن آپ مجھے پہناتی تھیں۔“

اس کے بعد آپؐ نے غمزدہ اہل خانہ کو اپنی قمیص مبارک مرحمت فرمائی اور ہدایت کی کہ انہیں میری قمیص کا کفن پہناؤ۔

پھر آپؐ نے اسامہ بن زیدؓ (حبّ النبیؐ) اور حضرت ابویؤب انصاریؓ (میزبانِ رسولؐ) کو حکم دیا کہ جنت البقیع میں جا کر قبر کھودیں۔ جب وہ قبر کا اوپر کا حصہ کھود چکے تو سرورِ کونینؐ خود نیچے اترے اور اپنے دستِ مبارک سے لحد کھودی اور خود ہی اس میں سے مٹی نکالی۔ جب یہ کام پورا ہو گیا تو ساتی ء کوثر لحد کے اندر لیٹ

گئے اور دعا مانگی:

”الہی میری ماں — کی مغفرت فرما اور ان کی قبر کو وسیع کر دے۔“
یہ دعا مانگ کر آپ قبر سے باہر نکلے تو شدتِ غم سے ریش مبارک ہاتھ میں
پکڑ رکھی تھی اور رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔
یہ خوش بخت اور عالی مرتبہ خاتون جن سے سید المرسلین خیر الخلاق فر
موجودات کو ایسا گہرا لگاؤ اور پیارتھا، حضرت فاطمہ بنتِ اسد تھیں۔

حضرت فاطمہ بنتِ اسد کا شمار ان جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے جو امتِ
مسلمہ کے لیے سرمایہء فخر و ناز ہیں۔ وہ سردارِ قریش ہاشم بن عبد مناف کی پوتی،
حضرت عبدالمطلب کی بھتیجی اور بہو، حضرت ابوطالب کی زوجہ، سرورِ کونین کی چچی
اور سہمن، حضرت جعفر طیارؓ شہیدِ موتہ اور شیر خدا حضرت علی المرتضیٰؓ کی والدہ اور
خاتونِ جنت سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی خوشدامن تھیں۔

حضرت فاطمہ کے والد اسد بن ہاشم، رحمتِ عالم ﷺ کے دادا حضرت
عبدالمطلب بن ہاشم کے سوتیلے بھائی تھے۔ (اسد کی والدہ کا نام قیلہ بنتِ عامر تھا
اور حضرت عبدالمطلب، سلمیٰ بنتِ عمرو بن زید نجاری کے بطن سے تھے) تاریخ میں
اسد بن ہاشم کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

حضرت فاطمہ نے قریش کے معزز ترین گھرانے بنو ہاشم میں آنکھیں کھولیں
اور اسی میں پروان چڑھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے نہایت اعلیٰ
اوصاف و خصائل کی مالک تھیں۔ چنانچہ حضرت عبدالمطلب کی نگاہ گوہر شناس نے
انہیں اپنی بہو بنانے کے لیے منتخب کر لیا اور اپنے فرزند عبد مناف (ابوطالب)
سے ان کا نکاح کر دیا۔ ان سے اللہ تعالیٰ نے انہیں چار فرزند اور تین لڑکیاں عطا
کیں۔ لڑکوں کے نام طالب، عقیل، جعفر اور علی تھے اور لڑکیوں کے نام ام ہانی

(ان کا اصل نام باختلاف روایت فاختہ، ہند یا فاطمہ تھا) جمانہ اور ربطہ تھے۔

علامہ ابن عبدالبر نے ”استیعاب“ میں لکھا ہے۔ ہی اول ہاشمیہ ولدت لہاشمی (یعنی یہ پہلی ہاشمی خاتون ہیں جن سے ہاشمی اولاد پیدا ہوئی) کہا جاتا ہے کہ وہ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتی تھیں، چنانچہ یہ شعر ان سے منسوب ہے، جو انہوں نے اپنے فرزند عقیل کے بارے میں کہا تھا:

انت تکون ساجد نبیل اذا تهب شمال بلیل

بعثت کے بعد رحمت عالم ﷺ نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو بنو ہاشم نے آپؐ کا سب سے زیادہ ساتھ دیا۔ حضرت فاطمہؑ کے فرزند حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ، تو دعوتِ حق پر لبیک کہنے والے اولین نوجوان (لڑکے) تھے۔ خود حضرت فاطمہؑ بھی ابتدائے دعوت میں سعادت اندوز اسلام ہو گئیں۔ کچھ عرصہ بعد ان کے دوسرے فرزند جعفرؑ بھی پرستارِ حق میں داخل ہو گئے۔

علامہ ابن اثیر نے ”أسد الغابہ“ میں لکھا ہے کہ ایک دن رحمت عالم حضرت علیؑ کے ساتھ مشغول عبادت تھے۔ حضرت ابوطالب نے انہیں دیکھا تو حضرت جعفرؑ سے فرمایا — ”بیٹے تم بھی اپنے ابن عم کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت جعفرؑ حضورؐ کی بائیں جانب کھڑے ہو گئے، عبادت میں انہیں ایسا لطف آیا کہ حضورؐ کے دارِ ارقم میں پناہ گزین ہونے سے پہلے ہی شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔

حضرت ابوطالب، حضرت فاطمہؑ، حضرت علیؑ اور حضرت جعفرؑ، رحمت عالم سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ فی الحقیقت حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد حضرت ابوطالب اور ان کی اہلیہ فاطمہؑ نے جس خلوص اور دلسوزی کے ساتھ سرورِ کونین کی سرپرستی کی اور نہایت نامساعد حالات میں بھی آپؐ کی حفاظت و حمایت میں جان کی بازی لگادی، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بعثت کے بعد جب اہل حق پر مشرکینِ قریش کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے تو سرورِ عالم ﷺ نے مسلمانوں کو

جش کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۔ بعد بعثت اور ۶۔ بعد بعثت میں مسلمانوں کے دو قافلے یکے بعد دیگرے ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر جش چلے گئے۔ ان مہاجرین میں حضرت فاطمہؓ کے فرزندِ دلہند حضرت جعفرؓ بھی تھے اور ان کے ساتھ ان کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس بھی تھیں۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت جعفرؓ پہلی ہجرتِ حبشہ کے شرکاء میں سے تھے، لیکن موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں لکھا ہے کہ وہ دوسری ہجرت کے مہاجرین میں سے تھے۔ بہر صورت حضرت فاطمہؓ نے بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ اپنے فرزند اور بہو کی جدائی برداشت کی۔

سے نبوت میں مشرکین قریش نے فیصلہ کیا کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو مطلب محمدؐ کو قتل کے لیے ان کے حوالے نہ کریں گے کوئی شخص ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔ نہ ان کے پاس کوئی چیز فروخت کی جائے گی اور نہ ان سے رشتہ نانا کیا جائے گا۔ اس فیصلہ کو معرضِ تحریر میں لا کر ہر قبیلہ کے نمائندے نے دستخط کیے یا انگوٹھا لگایا اور اسے در کعبہ پر آویزاں کر دیا۔ حضرت ابوطالب کو اس معاہدہ کا علم ہوا تو وہ ہاشم اور ان کے بھائی مطلب کی تمام اولاد و احفاد کو ساتھ لے کر شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہو گئے۔ صرف ابولہب اور اس کے زیر اثر چند ہاشمیوں نے مشرکین کا ساتھ دیا۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب مسلسل تین برس تک شعب ابی طالب میں زہرہ گداز مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ ان محصورین میں حضرت فاطمہ بنت اسد بھی تھیں۔ اس دورِ ابتلاء میں انہوں نے اپنے اہل کنبہ کے ساتھ کمال درجے کی ہمت اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔

۱۰۔ نبوت میں حضورؐ کے چچا حضرت ابوطالب نے وفات پائی تو آپؐ کی سرپرستی کی ذمہ داری حضرت فاطمہؓ نے اٹھالی، وہ اپنے فرزندوں سے بھی بڑھ کر آپؐ پر شفیق تھیں۔

جب عام مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا تو حضرت فاطمہؓ بھی ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئیں۔ ہجرت کے موقع پر ان کے لختِ جگر حضرت علی مرتضیٰؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ پر نور انہیں اپنے بستر پر سُلا کر سفرِ ہجرت پر روانہ ہوئے۔

ہجرتِ نبوی کے کچھ عرصہ بعد حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کے فرزندِ دلہند جناب علی مرتضیٰؓ کا نکاحِ رحمتِ عالم ﷺ کی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ الزہرا بتولؓ سے ہوا۔ اس موقع پر زوجِ بتولؓ نے اپنی والدہ ماجدہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

كفى فاطمه بنتِ رسولِ الله سقايةِ الماءِ والذهابِ في
الحاجةِ ويكفك الداخل الطحن والعجن۔

(فاطمہ بنتِ رسول اللہ آتی ہیں، میں پانی بھروں گا اور باہر کا کام

کروں گا اور وہ چکی پیسنے اور آٹا گوندھنے میں آپ کی مدد کریں گی)

رحمتِ عالم ﷺ کو حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد سے بڑی محبت تھی۔ آپ اکثر ان سے ملنے کے لیے تشریف لاتے اور ان کے گھر آرام فرماتے۔ حضورؐ نے کئی بار ان کی شفقت، شرافت اور خصائلِ حمیدہ کی تحسین فرمائی۔ ”درمنثور“ میں ہے:

”یہی فاطمہ ہیں جن کے فضائل و ماثر کتبِ سیر میں مذکور ہیں۔“

حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد نے ہجرت کے چند سال بعد رسولِ اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارک ہی میں وفات پائی۔ حضورؐ نے ان کی وفات کو شدت سے محسوس کیا۔ اپنی قمیص مبارک اتار کر کفن دیا اور تدفین سے پہلے قبر میں اتر کر لیٹ گئے۔ لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو فرمایا:

”ابوطالب کے بعد ان سے زیادہ میرے ساتھ کسی نے مہربانی نہیں

کی میں نے اپنی قمیص ان کو اس لیے پہنائی کہ جنت میں انہیں حِلّہ

ملے اور قبر میں اس لیے لیٹا کہ شہداءِ قبر میں آسانی ہو۔“

ایک روایت میں ہے کہ اس موقع پر حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتوں کو فاطمہؑ بنتِ اسد پر درود پڑھنے کا حکم دیا ہے۔
 حضرت فاطمہؑ بنتِ اسد کے فرزند عقیلؑ اور صاحبزادیوں اُم ہانیؑ اور جمانہؑ کو بھی قبولِ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی۔ ربطہ کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔
 جس خاتون کو سید المرسلینؐ فخرِ موجودات کی قمیص مبارک کا کفن ملا ہو اور جس کی آخری آرام گاہ سے رحمتِ دو عالم کا جسدِ اطہر مس ہوا ہو، اس کے علو مرتبت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔



حضرت فاطمۃ الزہراءؑ کی اولاد

سیدہ فاطمۃ الزہراءؑ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پانچ اولادیں عطا فرمائیں۔ تین لڑکے اور دو لڑکیاں ان کے اسمائے گرامی (ترتیب ولادت کے مطابق) یہ ہیں۔

۱- حضرت حسنؑ۔

۲- حضرت حسینؑ۔

۳- حضرت زینبؑ۔

۴- حضرت اُمّ کلثومؑ۔

۵- حضرت محسنؑ۔

معض مؤرخین محسن کے وجود سے انکار کرتے ہیں لیکن مسعودی، یعقوبی، ابوالفدا وغیرہ نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان سب کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ محسن صغریٰ میں فوت ہو گئے۔ مؤرخ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت فاطمہؑ کی تین بیٹیاں تھیں (تیسری بیٹی کا نام رقیہ بتایا گیا ہے) لیکن یہ روایت ضعیف ہے اور جمہور اہل سیر و تاریخ اس کی تائید نہیں کرتے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو ہر لحاظ سے مکمل بنانے کے لیے سیدہ فاطمہ الزہراءؑ کی عظیم المرتبت اولاد کے واقع زندگی بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے جائیں۔ اگلے صفحات میں یہ حالات ملاحظہ فرمائیے۔



سیدنا حضرت حسن بن علیؑ (الحسنؑ)

سیدنا حضرت حسنؑ، حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ الزہراءؑ کے پہلے صاحبزادے ہیں۔ ان کی کنیت ابو محمد ہے اور ریحانۃ النبی لقب۔ بعض روایتوں میں ان کے اور القاب بھی بیان کیے گئے ہیں مثلاً سید، شہر، مجتبیٰ اور شبیبہ رسول وغیرہ۔ ۱۵ رمضان (برولیت دیگر شعبان) ۳ ہجری کو مدینہ منورہ میں متولد ہوئے۔ حضرت علیؑ نے حرب نام رکھا تھا لیکن رسول اکرم ﷺ نے بدل کر حسن رکھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی کنیت ابو محمد بھی حضورؐ نے تجویز فرمائی تھی (حضرت حسنؑ نے بڑے ہو کر اپنے کسی فرزند کا نام محمد نہیں رکھا)

سرورِ عالم ﷺ کو حضرت حسنؑ کی ولادت پر بہت مسرت ہوئی۔ ان کے کان میں اذان دی اور اپنا لعاب دہن چٹایا۔ پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کیا۔ دو مینڈھے ذبح کرائے اور نومولود کے سر کے بال اتروا کر ان کے ہموزن چاندی صدقہ دی۔

سیدنا حضرت حسنؑ نے تقریباً آٹھ سال تک رحمتِ عالم ﷺ کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ حضورؐ اپنے تمام نواسوں نواسیوں سے بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ آپؐ کی محبت اور شفقت کے کچھ واقعات ایک الگ باب میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ:

”رسول اللہ ﷺ منبر پر تھے اور حسنؑ آپؐ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے

تھے۔ آپ ایک مرتبہ لوگوں کی طرف دیکھتے تھے اور ایک مرتبہ حسنؓ کی طرف۔ (اسی حال میں) فرمایا، یہ میرا بیٹا سید (سردار) ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔“

حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریراً رائے خلافت ہوئے وہ بھی ذات رسالت مآبؐ کے تعلق کی وجہ سے حضرت حسنؓ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ دونوں عصر کی نماز پڑھ کر اکٹھے مسجد سے نکلے۔ راستہ میں حضرت حسنؓ کھیل رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بڑی محبت و شفقت کے ساتھ ان کو اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھالیا اور فرمایا:

”خدا کی قسم یہ رسول اللہ ﷺ کے مشابہ ہے علی کے مشابہ نہیں۔“
حضرت علیؓ یہ سن کر ہنسنے لگے۔

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ مسند نشین خلافت ہوئے تو انہوں نے بھی حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے ساتھ ایسا ہی محبت آمیز برتاؤ رکھا۔ انہوں نے بیت المال قائم کیا اور مسلمانوں کے علیؓ قدر مراتب سالانہ وظائف مقرر کیے تو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے وظیفے اصحاب بدر کے وظیفوں کے برابر مقرر کیے (پانچ ہزار درہم سالانہ) خود امیر المؤمنینؓ اور حضرت علیؓ کا بھی اتنا ہی وظیفہ تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فاروقِ اعظمؓ کے نزدیک حسینؓ کی کیا قدر و منزلت تھی۔

سیدنا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے دورِ خلافت کا آغاز ہوا تو حضرت حسنؓ پورے جوان ہو چکے تھے۔ شیخینؓ کی طرح حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا سلوک بھی حضرت حسنؓ کے ساتھ نہایت مشفقانہ اور محبت آمیز تھا۔ ۳۰-۲۹ ہجری میں حضرت

عثمانؓ کے حکم سے حضرت سعیدؓ بن العاص نے طبرستان پر لشکر کشی کی تو حضرت حسنؓ بھی دوسرے نوجوانانِ قریش کے ساتھ اسلامی لشکر میں شریک ہو گئے اور کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔

سیدنا حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت کے آخر میں شورش برپا ہوئی اور باغیوں نے کاشانہء خلافت کا محاصرہ کر لیا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کو کاشانہء خلافت کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ کچھ اور جوانانِ قریش بھی ان کے ساتھ تھے۔ حضرت حسنؓ مدافعت کرتے ہوئے زخمی ہو گئے تاہم انہوں نے کسی باغی کو کاشانہء خلافت میں داخل نہ ہونے دیا۔ بالآخر باغی دوسری طرف سے دیوار پھاند کر اندر گھس گئے اور امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کو اس حالت میں شہید کر دیا، جب وہ قرآنِ پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کو شہادت کی خبر ہوئی تو انہوں نے جوشِ غضب میں حضرت حسنؓ کو تھپڑ مارا کہ تم نے کیسی حفاظت کی کہ باغیوں نے اندر گھس کر عثمانؓ کو شہید کر ڈالا۔ جب انہوں نے صورتِ حال کی وضاحت کی اور اپنے زخم دکھائے تو حضرت علیؓ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے حضرت علیؓ سے قبولِ خلافت کے لیے اصرار کیا اس موقع پر حضرت حسنؓ نے والدِ بزرگوار کو مشورہ دیا کہ جب تک تمام ممالکِ اسلامیہ کے لوگ آپ سے مسندِ نشینِ خلافت ہونے کی درخواست نہ کریں آپ کسی سے امرِ خلافت پر بیعت نہ لیجئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خلیفہ کا انتخاب مہاجرین اور انصار کا حق ہے۔ جب وہ کسی کو خلیفہ تسلیم کر لیں تو دوسرے تمام مسلمانوں پر اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔ بیعت کے لیے تمام دنیا کے مسلمانوں کے مشورہ کی شرط نہیں۔ چنانچہ انہوں نے خلافت قبول کر لی۔

حضرت علیؑ کے مسند نشینِ خلافت ہونے کے بعد اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اصلاح کا علم بلند کیا اور حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کا مطالبہ کیا۔ اسی سلسلے میں جنگِ جمل پیش آئی۔ جنگ سے پہلے حضرت حسنؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کوفہ گئے اور وہاں کے لوگوں کو اپنی حمایت پر ابھارا۔ ان کی مساعی کے نتیجہ میں تقریباً دس ہزار اہل کوفہ حضرت علیؑ کے لشکر میں شامل ہوئے۔ جنگ کے بعد ۳ھ میں جنگِ صفین پیش آئی اس میں بھی حضرت حسنؓ اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ تھے۔ التوائے جنگ کے لیے امیر معاویہؓ اور حضرت علیؑ کے درمیان جو معاہدہ ہوا حضرت حسنؓ نے ایک گواہ کی حیثیت سے اس پر دستخط کیے۔

رمضان ۴۰ھ میں ایک خارجی ابنِ ملجم نے حضرت علیؑ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ زخمی ہونے کے بعد وہ تین دن زندہ رہے۔ اس اثناء میں ان سے حضرت حسنؓ کی جانشینی کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

”نہ میں حکم دیتا ہوں نہ روکتا ہوں۔“

تیسرے دن حضرت علیؑ واصلِ جنت ہو گئے۔ ان کی تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد کوفہ کی مسجدِ جامع میں حضرت حسنؓ کے لیے بیعتِ خلافت ہوئی۔ بعض روایتوں کے مطابق بیس ہزار سے زیادہ لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت امیر معاویہؓ والیءِ شام نے ان کی خلافت کو تسلیم نہ کیا اور عراق کی طرف فوجی پیشقدمی شروع کر دی۔ ان کے مقدمۃ الجیش کے افسر حضرت عبداللہ بن عامر انبار ہوتے ہوئے مدائن کی طرف بڑھے۔ حضرت حسنؓ اس وقت کوفہ میں تھے انہیں عبداللہ بن عامر کی پیشقدمی کی اطلاع ملی تو وہ بھی اہل عراق کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لیے مدائن کی طرف روانہ ہوئے۔ ساباط پہنچ کر انہوں نے اپنی فوج میں کمزوری اور جنگ سے پہلو تہی کے آثار دیکھے تو اس کے سامنے ایک خطبہ دیا جس

میں فرمایا:

”لوگو! میں کسی مسلمان کے خلاف اپنے دل میں کینہ نہیں رکھتا اور تمہارے لیے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک رائے پیش کرتا ہوں امید ہے تم اسے رد نہ کرو گے۔ جس اتحاد اور یگانگت کو تم ناپسند کرتے ہو وہ اس تشمت و افتراق سے بہتر ہے جو تم کو پسند ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر لوگ جنگ سے گریز کرنا چاہتے ہیں میں تم لوگوں کو تمہاری مرضی کے خلاف لڑنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتا۔“

حضرت حسنؓ کی تقریر سن کر وہ لوگ جو امیر معاویہؓ کے شدید مخالف تھے اور ان سے لڑنا فرض عین سمجھتے تھے، برہم ہو گئے۔ انہوں نے سیدنا حسنؓ کی تحقیر کی اور انہیں گھیر لیا۔ ربیعہ اور ہمدان کے قبیلوں نے ان لوگوں کو پیچھے ہٹایا اور حضرت حسنؓ گھوڑے پر سوار ہو کر مدائن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک خارجی جراح بن قبیصہ نے گھات لگا کر ان پر حملہ کیا اور زانوائے مبارک زخمی کر دیا۔ عبداللہ بن حنظل اور عبداللہ بن ظبیان نے جراح بن قبیصہ کو پکڑ کر قتل کر ڈالا اور حضرت حسنؓ نے مدائن پہنچ کر قصر ابیض میں قیام کیا۔ جب زخم مندمل ہو گیا تو وہ پھر عبداللہ بن عامر کے مقابلہ کے لیے مدائن سے نکلے۔ اس اثناء میں امیر معاویہؓ بھی ایک فوج گراں کے ساتھ انبار پہنچ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عامر نے حضرت حسنؓ کو پیغام بھیجا جس میں ان کو قسم دے کر جنگ ملتوی کرنے کے لیے کہا۔ حضرت حسنؓ کے ساتھیوں نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا۔ اس پر حضرت حسنؓ پھر مدائن لوٹ گئے۔ عبداللہ بن عامر نے فوراً مدائن کے گرد اپنی فوج پھیلا دی۔ حضرت حسنؓ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی کمزوری اور بزدلی سے دل برداشتہ تھے انہوں نے جنگ کا خیال ترک کر دیا اور چند شرائط پر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست برداری کا

فیصلہ کر لیا۔ یہ شرائط انہوں نے عبداللہ بن عامر کی وساطت سے امیر معاویہؓ کو بھیجا دیں۔ (الاخبار الطوال، ابوحنیفہ دینوری)

حافظ ابن عبدالبر نے ”الاستیعاب“ میں لکھا ہے کہ سیدنا حضرت حسنؓ نے حالات کے رخ سے اندازہ کر لیا تھا کہ فریقین میں سے کسی ایک کی شکست اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ مکمل طور پر تباہ و برباد نہ ہو جائے۔ چونکہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی ان کو پسند نہ تھی اس لیے انہوں نے صلح ہی میں بہتری سمجھی اور اس سلسلہ میں امیر معاویہؓ کو ایک خط بھیجا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن سعد کے حوالے سے ”الاصابہ“ میں بیان کیا ہے کہ حضرت حسنؓ نے عمرو بن سلمۃ الارجی کو صلح کی غرض سے امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا۔ امیر معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن عامر اور حضرت عبدالرحمنؓ بن سمرہ کو حضرت حسنؓ کے پاس بھیجا۔ ان دونوں نے حضرت حسنؓ کی شرائط مان لیں۔ اس طرح فریقین میں صلح ہو گئی۔ پھر حضرت امیر معاویہؓ اور سیدنا حضرت حسنؓ ساتھ ساتھ کوفہ میں داخل ہوئے۔

صحیح بخاری میں یہ واقعہ کسی قدر مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

”حضرت حسنؓ کی فوج پہاڑوں کے مانند امیر معاویہؓ کے لشکر کی طرف بڑھی تو حضرت عمرو بن العاص نے حضرت معاویہؓ سے کہا:

— میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ایسا لشکر ہے جو اس وقت تک پیٹھ نہ پھیرے گا جب تک اپنے اقران کو قتل نہ کر لے گا۔

حضرت معاویہؓ نے کہا، اگر یہ لوگ انہیں اور وہ انہیں قتل کر دیں تو میری طرف سے لوگوں کے معاملات کا نیز ان کی عورتوں اور بچوں کا ذمہ دار کون ہوگا؟

اس وقت انہوں نے عبداللہ بن عامر اور عبدالرحمن بن سمرہ کو حضرت حسنؑ سے گفت و شنید کے لیے بھیجا۔

ابوحنیفہ دینوری نے ”الاخبار الطوال“ میں لکھا ہے کہ حضرت حسنؑ ان شرائط پر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے:

۱- سب لوگوں کو بلا استثنا امان دی جائے گی اور کوئی عراقی محض بغض و کینہ کی بناء پر نہ پکڑا جائے گا۔

۲- صوبہ اہواز کا کل خراج حضرت حسنؑ کے لیے مخصوص ہوگا اور حضرت حسینؑ کو دو لاکھ درہم سالانہ الگ دیئے جائیں گے۔

۳- صلوات اور عطیات میں بنو ہاشم کو بنو امیہ پر ترجیح دی جائے گی۔

حضرت حسنؑ نے یہ شرطیں لکھ کر حضرت عبداللہ بن عامر کو دیں۔ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے پاس بھیج دیں۔ امیر معاویہؓ نے تمام شرطوں کی منظوری کا خط لکھ کر اپنی مہر لگائی اور معززین و عمائد کی شہادتیں لکھوا کر کاغذ حضرت حسنؑ کے پاس واپس بھیج دیا۔ اس طرح ملت اسلامیہ کے سر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا اور تمام مسلمان ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے بجائے امیر معاویہؓ کی خلافت پر متفق ہو گئے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ سیدنا حضرت حسنؑ نے کوفہ کی جامع مسجد میں مجمع عام کے سامنے اپنی دست برداری کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

”لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے اگلوں کے ذریعے سے تم کو ہدایت دی اور پچھلوں کے ذریعے تمہاری خونریزی بند کرائی۔ دانائیوں میں بہترین دانائی تقویٰ اور عجز میں سب سے بڑا عجز فجور (بد اعمالی) ہے اور یہ امر (خلافت) جو ہمارے اور معاویہؓ کے درمیان متنازعہ فیہ ہے یا تو وہ اس کے مجھ سے زیادہ حقدار ہیں یا یہ میرا حق ہے جس سے میں اللہ عز و جل کی خوشنودی، اُمتِ محمدیہ کی اصلاح اور تم لوگوں کو

خونریزی سے بچانے کی خاطر دستبردار ہوتا ہوں۔“

اس کے بعد سیدنا حضرت حسنؓ اپنے اہل و عیال کو لے کر مدینہ منورہ چلے گئے۔ اس طرح سرورِ عالم ﷺ کی یہ پشین گوئی پوری ہو گئی۔

”میرا یہ بیٹا سید ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔“

سیدنا حضرت حسنؓ کی مدتِ خلافت کے بارے میں روایتوں میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں میں چار ماہ اور بعض میں آٹھ ماہ سے کچھ اوپر بتائی گئی ہے۔ ”دائرہ معارفِ اسلامیہ“ کے مطابق صحیح یہ ہے کہ ان کا زمانہء خلافت ۲۰ رمضان ۴۰ھ سے ۱۵ جمادی الاولیٰ ۴۱ھ تک ہے۔ گویا وہ سات ماہ ۲۶ دن تک مسندِ نشینِ خلافت رہے۔

دستبرداری کے بعد سیدنا حضرت حسنؓ نے اپنی وفات تک کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا اور نہایت خاموشی سے اپنے نانا کے جوار میں زندگی گزاری۔ ان کے وقت کا بیشتر حصہ عبادتِ الہی میں گزرتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت معاویہؓ نے مدینہ منورہ کے کسی شخص سے حضرت حسنؓ کے حالات دریافت کیے تو اس نے کہا:

”فجر کی نماز سے طلوعِ آفتاب تک مصلے پر رہتے ہیں پھر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ملاقات کے لیے آنے والوں سے ملتے ہیں۔ دن چڑھے چاشت کی نماز ادا کر کے اُمہات المؤمنینؓ کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ (ابن عساکر)

مکہ معظمہ میں ہوتے تو عصر کی نماز بالالتزام حرمِ پاک میں ادا کرتے اور پھر طواف میں مشغول ہو جاتے۔

فکرِ معاش کی طرف سے بے نیاز تھے کیونکہ ابوہاز کا سالانہ خراج ان کے

لیے مخصوص تھا۔ امام شعمی کا بیان ہے کہ اس خراج کی رقم دس لاکھ درہم سالانہ تھی۔ اس کثیر آمدنی کو وہ بے دریغ راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ انہوں نے دو مرتبہ اپنا تمام مال اسباب اور تین مرتبہ کل مال اسباب کا نصف راہِ خدا میں بانٹ دیا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی سائل ان کے در سے خالی ہاتھ چلا جائے۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنا ان کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ طواف میں مشغول تھے کہ کسی شخص نے اپنی ضرورت کے لیے ساتھ لے جانا چاہا۔ طواف چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو گئے اور واپس آ کر طواف پورا کیا۔ ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے کہ کوئی سائل آ گیا۔ انہوں نے اعتکاف کے دائرے سے نکل کر اس کی ضرورت پوری کی اور پھر اعتکاف میں بیٹھ گئے۔

سیدنا حضرت حسنؓ نے باختلاف روایت ۳۹ھ یا ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں اپنی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ الزہراءؓ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اکثر ارباب سیر نے لکھا ہے کہ سیدنا حضرت حسنؓ کی وفات زہر سے ہوئی جو ان کی ایک بیوی جعدہ بنت اشعث نے (کسی وجہ سے) دیا۔ حافظ ابن عبدالبرؒ اور المسعودی کا بیان ہے کہ حضرت حسنؓ کو کئی بار زہر دیا گیا لیکن جو زہر آخری بار دیا گیا وہی فیصلہ کن ثابت ہوا۔ بعض روایتوں کے مطابق زہر کھانے کے تیسرے دن اور بعض کے مطابق چالیس دن علیل رہنے کے بعد وفات پائی۔ حافظ ابن حجرؒ اور ابوحنیفہ دینوری نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت حسنؓ کی موت زہر سے نہیں بلکہ کسی اور علالت سے ہوئی۔ (الاصابہ — الاخبار الطوال)

سیدنا حضرت حسنؓ کی رحلت کی خبر پھیلی تو ہر طرف کھرام برپا ہو گیا۔ مدینہ منورہ کے بازار بند ہو گئے اور ہر شخص فرطِ غم سے نڈھال ہو گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ مسجد نبویؐ میں رو رو کر کہتے تھے — ”لوگو آج خوب رو لو کہ رسول اللہ ﷺ کا

محبوب دنیا سے اٹھ گیا۔

جنازہ میں اس قدر ہجوم تھا کہ اس سے پہلے مدینہ منورہ میں بہت کم دیکھنے میں آیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق جنازہ میں لوگوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ اگر سوئی بھی پھینکی جاتی تو زمین پر نہ گرتی۔

سیدنا حضرت حسنؑ نے اپنی زندگی میں بہت سے نکاح کیے۔ مختلف بیویوں سے آٹھ لڑکے پیدا ہوئے جن کے نام یہ ہیں:

الحسن، زید، عمر، قاسم، ابوبکر، عبدالرحمن، طلحہ، عبید اللہ۔

سیدنا حضرت حسنؑ جس خانوادے میں پلے بڑھے وہ علم و فضل کا سرچشمہ تھا۔ اس لیے فضل و کمال کے لحاظ سے وہ بھی نہایت بلند مقام پر فائز ہو گئے۔ ان کا شمار مدینہ منورہ کے ان اصحاب میں ہوتا تھا جو علم و افتاء کے منصب پر فائز تھے۔ ان کے چند فتاویٰ بھی کتابوں میں موجود ہیں۔

سیدنا حضرت حسنؑ عہد نبوی میں کمسن تھے۔ تاہم روایت حدیث سے ان کا دامن خالی نہیں رہا۔ ان سے تیرہ احادیث مروی ہیں۔ دینی علوم کے علاوہ وہ اس زمانہ کے مروجہ فنون میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اونچے درجے کے خطیب تھے اور شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔

شکل و شمائل میں سیدنا حضرت حسنؑ رسول اکرم ﷺ سے مشابہ تھے۔ سیرت بھی نہایت پاکیزہ تھی۔ ان کے گلشن اخلاق میں زہد و استغنا، حلم و تحمل، جود و سخا، خوش خلقی، امن پسندی، صلح جوئی، نرم خوئی اور خیر خواہی امت نہایت خوش رنگ پھول ہیں۔ دوسرے فضائل اخلاق کے ساتھ نہایت عاقل و دانا بھی تھے۔ اہل سیر نے ان کے بہت سے حکیمانہ اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ مکارم اخلاق دس ہیں۔

- (۱) زبان کی سچائی۔ (۲) حُسنِ خُلق۔ (۳) صلہء رحمی۔
 (۴) مہمان نوازی۔ (۵) حق دار کی حق شناسی۔
 (۶) جنگ کے وقت حملہ کی شدت۔
 (۷) سائل کو دینا۔ (۸) احسان کا بدلہ دینا۔
 (۹) پڑوسی کی حفاظت و حمایت۔ (۱۰) شرم و حیا۔
- ۲- سب سے اچھی زندگی وہ بسر کرتا ہے جو اپنی زندگی میں دوسروں کو بھی شریک کرے اور سب سے بُری زندگی اس کی ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا زندگی بسر نہ کر سکے۔
- ۳- ضرورت کا پورا نہ ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس کے لیے کسی نا اہل کی طرف رجوع کیا جائے۔
- ۴- ایک شخص نے کہا کہ مجھ کو موت سے بہت ڈر معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا، اس لیے کہ تم نے اپنا مال پیچھے چھوڑ دیا ہے اگر اس کو آگے بھیج دیا ہوتا تو اس تک پہنچنے کے لیے خوفزدہ ہونے کے بجائے مسرور ہوتے۔
- ۵- مروءۃ یہ ہے کہ انسان اپنے مذہب کی اصلاح کرے، اپنے مال کی دیکھ بھال اور نگرانی کرے، اسے بر محل صرف کرے، سلام زیادہ کرے، لوگوں میں محبوبیت حاصل کرے۔ کرم یہ ہے کہ مانگنے سے پہلے دے۔ احسان و سلوک کرے، بر محل کھلائے پلائے، بہادری یہ ہے کہ پڑوسی کی طرف سے مدافعت کرے، آڑے وقتوں میں اس کی حمایت و امداد کرے اور مصیبت کے وقت صبر کرے۔
- ۶- ایک مرتبہ امیر معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ حکومت میں ہم پر کیا فرائض ہیں۔ فرمایا جو سلیمان بن داؤد نے بتائے ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے کہا، انہوں نے کیا بتایا ہے۔ فرمایا، انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو بتایا کہ بادشاہ کے لیے

لازم ہے کہ وہ ظاہر و باطن دونوں میں اللہ کا خوف کرے۔ غصہ اور خوشی
 دونوں میں عدل و انصاف کرے، فقر اور تمول میں درمیانی چال رکھے،
 زبردستی کسی کا مال نہ غصب کرے اور نہ اس کو بے جا صرف کرے۔ جب
 تک وہ ان باتوں پر عمل کرتا رہے گا اس وقت تک اس کو دنیا میں کوئی نقصان
 نہیں پہنچا سکتا۔



سیدنا حضرت حسینؑ بن علیؑ

(الحسینؑ شہید کربلا)

سیدنا حضرت حسینؑ، حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ الزہراءؑ کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ اور سید، شہید، شہیر، سبط اصغر اور ریحانۃ النبی القاب ہیں۔ ۳ یا ۴ یا ۵ شعبان ۴ ہجری کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت باسعادت کی خبر سن کر سرورِ عالم ﷺ حضرت فاطمہؑ کے گھر تشریف لائے اور نومولود بچے کے کانوں میں اذان دی۔ پھر آپؑ نے سیدہ فاطمہؑ کو عقیقہ کرنے اور بچے کے بالوں کے ہموزن چاندی خیرات کرنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کی۔ والدین نے بچے کا نام حرب رکھا تھا لیکن حضورؐ نے بدل کر حسین نام رکھا۔

سیدنا حضرت حسینؑ نے تقریباً سات سال تک سرورِ کونینؑ کے سایہء عاطفت میں پرورش پائی۔ دوسرے نواسوں نواسیوں کی طرح حضور حضرت حسینؑ سے بھی غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ حضورؐ کی ان کے ساتھ محبت و شفقت کے واقعات ایک الگ باب میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

سرورِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد خلیفۃ الرسول سیدنا حضرت ابو بکر صدیقؓ اور امیر المؤمنین سیدنا حضرت عمر فاروقؓ بھی حضرت حسینؑ کو ہمیشہ نہایت عزیز جانتے رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بدری صحابہؓ کے لڑکوں کے وظیفے مقرر کیے تو

جہاں دوسرے اصحاب بدر کے لڑکوں کا دو دو ہزار وظیفہ مقرر کیا وہاں حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کے فرزندوں حسنؑ اور حضرت حسینؑ کا پانچ پانچ ہزار وظیفہ مقرر کیا جو خود اصحاب بدر (بشمول حضرت علیؑ) کے وظیفہ کے برابر تھا۔ فاروقِ اعظمؓ نے انہیں دوسرے لڑکوں پر اس وجہ سے ترجیح دی کہ وہ ان کے آقا و مولا رسول اللہ ﷺ کے محبوب نواسے تھے۔

ایک مرتبہ یمن سے بہت سے حُلے آئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو صحابہؓ میں تقسیم کر دیا۔ اتفاق سے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کے حصے میں کوئی حُلہ نہ آیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا اور حاکمِ یمن کو حکم بھیجا کہ فوراً دو حُلے اور بھیجو۔ جب تک یہ حُلے آنے لگے اور حسینؑ نے پہن نہ لیے حضرت عمر فاروقؓ بے چین رہے۔ (بلاذری)

ایک اور روایت کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے پہلے حُلّوں کو حسینؑ کے لائق نہ سمجھا اور حاکمِ یمن کو فرمان بھیجا کہ دو نئے عمدہ قسم کے حُلے بھیجو۔ یہ حُلے آئے تو امیر المؤمنینؑ نے حسینؑ کو پہنائے اور بڑی مسرت کا اظہار کیا۔

(ابن عساکر)

حضرت حسینؑ کبھی کبھی حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ طفلانہ شوخی کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ امیر المؤمنینؑ ان باتوں کو برداشت کرتے تھے اور حضرت حسینؑ سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔

سیدنا حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں طبرستان پر فوج کشی ہوئی (۳۰ھ) تو سیدنا حضرت حسینؑ اپنے برادرِ بزرگ حضرت حسنؑ کے ساتھ اس میں مجاہدانہ شریک ہوئے۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی خلافت کے آخری سال باغیوں نے کاشانہ خلافت کا محاصرہ کیا تو حضرت علیؑ نے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ دونوں کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور کیا۔ انہوں نے بعض دوسرے

اصحاب کے ساتھ مل کر باغیوں کو کا شانہء خلافت کے اندر گھسنے سے روکے رکھا لیکن باغی دوسری طرف سے دیوار پھاند کر اندر گھس گئے اور امیر المؤمنین سیدنا حضرت عثمانؓ کو نہایت بے دردی سے شہید کر ڈالا۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے دونوں بھائیوں سے باز پرس کی کہ تمہارے ہوتے ہوئے باغی کیسے اندر گھس گئے۔ انہوں نے جب واقعہ بیان کیا تو حضرت علیؓ ایک آہ سرد بھر کر خاموش ہو گئے۔

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں حضرت حسینؓ نے جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں اپنے پدرِ گرامی کی طرف سے پُر زور حصہ لیا۔ جنگِ صفین کے التوا کے سلسلے میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس پر حضرت حسینؓ نے بھی اپنی گواہی ثبت کی۔ اس کے بعد انہوں نے نہروان میں خوارج کے خلاف دادِ شجاعت دی اور ان کی سرکوبی میں بڑی سرگرمی دکھائی۔

۴۰ھ میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ چند ماہ بعد انہوں نے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست برداری کا ارادہ ظاہر کیا تو حضرت حسینؓ نے اس کی پُر زور مخالفت کی لیکن وہ حضرت حسنؓ کو اپنا ارادہ پورا کرنے سے روکنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں قسطنطنیہ پر لشکر کشی ہوئی (۴۹ھ) تو حضرت حسینؓ نے اس میں مجاہدانہ شرکت کی۔ اسی زمانے میں انہیں اپنے برادرِ بزرگ حضرت حسنؓ کی دائمی مفارقت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔

امیر معاویہؓ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے یزید کو ولی عہد بنایا اور اہل مدینہ سے یزید کی بیعت لینی چاہی تو حضرت حسینؓ اور کچھ دوسرے اصحاب یزید کی بیعت پر آمادہ نہ ہوئے۔ تاہم امیر معاویہؓ نے ان سے چنداں تعرض نہ کیا۔ انہوں نے ۶۰ھ میں اپنی وفات سے پہلے یزید کو حضرت حسینؓ کے بارے میں یہ وصیت

کی۔

”میرے بعد اہل عراق حسینؑ کو تمہارے مقابلہ میں ضرور لائیں گے۔
جب وہ تمہارے مقابلہ میں کھڑے ہوں اور تم کو ان پر قابو حاصل ہو
جائے تو درگزر سے کام لینا کیونکہ وہ قرابت دار، بڑے حقدار اور رسول
اللہ ﷺ کے عزیز ہیں۔ (طبری و الفخری)

یزید تختِ حکومت پر بیٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ جب تک سیدنا حضرت
حسینؑ اور سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسی اہم اور صاحبِ اثر شخصیتیں اس کی
بیعت نہیں کریں گی اس کی حکومت خطرے میں رہے گی۔ چنانچہ اس نے حاکم
مدینہ ولید بن عتبہ کو حکم بھیجا کہ ان دونوں بزرگوں سے میری بیعت لو۔ یہ دونوں
بزرگ اس وقت مدینہ میں مقیم تھے۔ ولید نے انہیں یزید کی بیعت کی ترغیب دی تو
انہوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کی مہلت مانگی، ولید نے مہلت دے دی۔ اس
دوران میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور سیدنا حضرت حسینؑ اپنے اہل و عیال سمیت
نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ کچھ
عرصہ سے اہل کوفہ حضرت حسینؑ کو خط پر خط لکھ رہے تھے کہ آپ کوفہ تشریف لائیں
تو ہم سب آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ سیدنا حسینؑ مکہ پہنچے تو اہل کوفہ نے
انہیں اپنے ہاں بلانے کے لیے خطوں کا تار باندھ دیا۔ حضرت حسینؑ نے تحقیق
احوال کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حضرت مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا۔ وہاں ہزاروں
آدمیوں نے مسلمؓ کے ہاتھ پر سیدنا حسینؑ کی بیعت کر لی۔ مسلم بن عقیلؓ نے تمام
کیفیت حضرت حسینؑ کو لکھ بھیجی۔ ان کا خط ملنے پر سیدنا حسینؑ اپنے اہل و عیال اور
جاں نثاروں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکہ سے عازم کوفہ ہو گئے۔

دوسری طرف یزید کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے عبید اللہ بن زیاد والی

بصرہ کو حکم بھیجا کہ بصرہ کے ساتھ تم کوفہ کی امارت بھی سنبھالو اور خود کوفہ جا کر وہاں کے لوگوں سے میری بیعت لو۔ ابن زیاد نے کوفہ پہنچ کر بڑی سختی سے کام لیا۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ کو گرفتار کر کے شہید کر دیا اور اہل کوفہ سے بزور یزید کی بیعت لے لی۔ سیدنا حسینؓ راستے ہی میں تھے کہ انہیں مسلم بن عقیلؓ کی شہادت اور کوفیوں کی غدارگی کی اطلاع ملی لیکن انہوں نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا۔ حضرت حسینؓ اپنے اہل و عیال اور ساٹھ ستر جاں نثاروں کے ساتھ ارضِ نینوا میں پہنچے تو ۳ محرم ۶۱ھ کو کربلا کے مقام پر ابن زیاد کے بھیجے ہوئے شامی لشکر نے انہیں گھیر لیا۔ ۷ محرم کو شامی فوج نے دریائے فرات پر پہرے بٹھا دیئے تاکہ سیدنا حسینؓ اور ان کے رفقاء دریا سے پانی نہ لے سکیں۔

۱۰ محرم ۶۱ھ ہجری کو کربلا کا دلدوز سانحہ پیش آیا جس میں سیدنا حسینؓ نے اپنے فرزندوں، بھتیجیوں اور بعض دوسرے عزیزوں اور جاں نثاروں کے ساتھ شامی لشکر کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ سانحہ کربلا کے کچھ واقعات ہم نے اختصار کے ساتھ حضرت زینبؓ بنتِ علیؓ کے حالات میں بیان کر دیئے ہیں۔

سیدنا حضرت حسینؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں جن سے متعدد اولادیں ہوئیں۔ اولادِ نرینہ میں سے صرف ایک علیؓ بن الحسینؓ (جو زین العابدین کے لقب سے مشہور ہیں) باقی بچے اور انہیں سے نسل چلی۔ ایک نوجوان فرزند علی اکبرؓ اور ایک شیر خوار صاحبزادے علی اصغرؓ واقعہ کربلا میں شہید ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک اور فرزند عبداللہ بن حسینؓ نے بھی کربلا میں شہادت پائی۔ صاحبزادیوں کی تعداد اکثر اہل سیر نے تین بتائی ہے۔ سکینہؓ، فاطمہؓ اور زینبؓ۔

سیدنا حضرت حسینؑ نے خانوادہ نبویؐ میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے معدنِ فضل و کمال بن گئے تھے۔ چونکہ عہدِ رسالت میں کمسن تھے اس لیے جنابِ رسالت مآبؐ سے براہِ راست سنی ہوئی مرویات کی تعداد صرف آٹھ ہے۔ البتہ بالواسطہ روایات کی تعداد کافی ہے۔ حضورؐ کے علاوہ انہوں نے جن بزرگوں سے احادیثِ روایت کی ہیں ان میں حضرت علیؑ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت فاطمہ الزہراءؑ، حضرت ہند بن ابی ہالہ کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے رواۃ حدیث میں برادرِ بزرگ حضرت حسنؑ، صاحبزادے حضرت علی زین العابدینؑ، صاحبزادیاں حضرت سکینہؑ و حضرت فاطمہؑ پوتے حضرت محمد باقرؑ، شعیبؑ، عکرمہؑ، سنان بن ابی سنان، عبداللہ بن عمرو بن عثمانؑ، فرزوق شاعر وغیرہ شامل ہیں۔

تمام اربابِ سیر نے سیدنا حضرت حسینؑ کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ بڑے فاضل تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، قضا و افتاء میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ سیدنا حضرت حسینؑ نے ان کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی تھی اس لیے وہ بھی مسندِ افتاء پر فائز ہو گئے تھے اور اکابرِ مدینہ مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن زبیرؑ نے ان سے پوچھا کہ قیدی کو رہا کرانے کا فرض کس پر عائد ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا، ان لوگوں پر جن کی حمایت میں وہ لڑا ہو۔ ایک اور موقع پر ابنِ زبیرؑ نے ان سے استفتاء کیا کہ شیر خوار بچہ کا وظیفہ کب واجب ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا پیدائش کے فوراً بعد جب بچے کے منہ سے آواز نکلتی ہے اس کا وظیفہ واجب ہو جاتا ہے۔

سیدنا حضرت حسینؑ دینی علوم کے علاوہ اس عہد کے عرب کے مروجہ علوم میں بھی پوری دسترس رکھتے تھے۔ ان کے تبحرِ علمی، علم و حکمت اور فصاحت و بلاغت کا اندازہ ان کے خطبات سے کیا جاسکتا ہے جن میں سے کچھ آج بھی کتبِ سیر میں محفوظ ہیں۔

فضائلِ اخلاق کے اعتبار سے سیدنا حضرت حسینؑ پیکرِ محاسن تھے۔ عبادت و ریاضت ان کا معمول تھا۔ قائم اللیل اور دائم الصوم تھے۔ فرض نمازوں کے علاوہ بکثرت نوافل پڑھتے تھے۔ ان کے فرزند حضرت علی زین العابدینؑ کا بیان ہے کہ وہ شب و روز میں ایک ایک ہزار نمازیں (نوافل) پڑھ ڈالتے تھے۔ روزے بکثرت رکھتے تھے اور سادہ غذا سے افطار فرماتے تھے۔ رمضان المبارک میں کم از کم ایک مرتبہ قرآن پاک ضرور ختم کرتے۔ حج بھی بکثرت کرتے تھے اور وہ بھی بالعموم پا پیادہ، ایک روایت کے مطابق انہوں نے پچیس حج پا پیادہ کیے۔ (تہذیب الاسماء، امام نوویؒ)

سیدنا حضرت حسینؑ مالی حیثیت سے نہایت آسودہ حال تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں ۵ ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا جو انہیں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے زمانہ تک برابر ملتا رہا۔ سیدنا حضرت حسنؑ نے خلافت سے دست برداری کے وقت امیر معاویہؓ سے ان کے لیے دو لاکھ سالانہ مقرر کرادیئے تھے۔ اس مرفہ الحالی کے باوجود ان کی زندگی پر فقر و زہد کا اثر نمایاں تھا۔ اپنا مال کثرت سے راہِ خدا میں لٹاتے رہتے تھے۔ کوئی سائل ان کے در سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ بعض مرتبہ غربا کے گھروں پر خود کھانا پہنچاتے تھے۔ اگر کسی قرضدار کی سقیم حالت کا پتہ چلتا تو خود اس کا قرض ادا کر دیتے تھے۔

ایک دفعہ نماز میں مشغول تھے کہ گلی میں ایک سائل کی آواز کانوں میں پڑی۔ جلدی جلدی نماز ختم کر کے باہر نکلے۔ صدا دینے والے سائل کی خستہ حالی دیکھی تو اپنے خادم قنبر کو آواز دی، وہ حاضر ہوئے تو پوچھا، ہمارے اخراجات میں سے کچھ باقی رہ گیا ہے؟ قنبر نے جواب دیا، آپ نے دو سو درہم اہل بیت میں تقسیم کرنے کے لیے دیے تھے وہ ابھی تقسیم نہیں کیے گئے ہیں فرمایا یہ ساری رقم لے آؤ اہل بیت سے زیادہ ایک مستحق آگیا ہے۔ قنبر نے دو سو درہم لا کر پیش کیے تو سب کے

سب سائل کو دے دیے اور ساتھ ہی معذرت کی کہ اس وقت میرا ہاتھ خالی ہے اس سے زیادہ خدمت نہیں کر سکا۔

صدقات و خیرات کے علاوہ اہل علم اور شعراء کی سرپرستی بھی کرتے تھے اور ان کو انعام کے طور پر بڑی بڑی رقموں سے نوازتے رہتے تھے۔

سیدنا حسینؑ کی مجالس وقار اور متانت کا مرقع ہوتی تھیں۔ لوگ ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے اور ان کے سامنے ایسے سکون اور خاموشی سے بیٹھتے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ اس وقار متانت اور بلندی مرتبت کے باوجود سیدنا حسینؑ تمکنت اور خود پسندی سے کوسوں دور تھے اور بے حد حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھے نہایت کم حیثیت کے لوگوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی طرف جا رہے تھے، راستے میں کچھ فقراء کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے حضرت حسینؑ کو دیکھ کر اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ آپ سواری سے اتر پڑے اور فرمایا:

”ان الله لا يحب المتكبرين“

(بیشک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

پھر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ فارغ ہوئے تو ان سب کو دعوت پر بلایا جب وہ لوگ حاضر ہوئے تو آپ نے گھر والوں کو حکم دیا، جو کچھ ذخیرہ ہے وہ سب بھجوادو۔

ارباب سیر نے سیدنا حضرت حسینؑ کے بہت سے کلمات طیبات نقل کیے ہیں جو دانش و حکمت اور پند و موعظت کا خزانہ ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱- جلد بازی نادانی ہے۔

۲- حلم زینت ہے۔

۳- صلہ رحمی نعمت ہے۔

- ۴- راست بازی عزت ہے۔
- ۵- جھوٹ عجز ہے۔
- ۶- بخل افلاس ہے۔
- ۷- سخاوت دولت مندی ہے۔
- ۸- نرمی عقلمندی ہے۔
- ۹- رازداری امانت ہے۔
- ۱۰- حُسنِ خُلق عبادت ہے۔
- ۱۱- عمل تجربہ ہے۔
- ۱۲- امداد دوستی ہے۔
- ۱۳- اچھے کام کرتے رہو مگر دل سے۔
- ۱۴- ایسا کام جو تم نے نہیں کیا، اس کا شمار نہ کرو۔
- ۱۵- حاجت مند نے تم سے سوال کر کے اپنی آبرو کا خیال نہ رکھا تو تم اس کی حاجت روائی کر کے اپنی آبرو قائم رکھو۔
- ۱۶- جو اپنے بھائی کی دنیاوی مصیبت میں کام آیا تو اللہ اس کی آخرت کی مصیبت دور کرتا ہے۔
- ۱۷- سب سے زیادہ معافی دینے والا وہ ہے جو بدلہ لینے کی قدرت رکھتا ہو اور پھر بدلہ نہ لے۔
- ۱۸- اپنی زیادہ تعریف کرنا ہلاکت کا باعث ہے۔
- ۱۹- عطا کے ذریعے نیک نامی حاصل کرو۔
- ۲۰- گمراہی سے شہرت پیدا نہ کرو۔
- ۲۱- جو سخاوت کرتا ہے سردار بنتا ہے جو کنجوسی کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے۔
- ۲۲- سب سے زیادہ سخی وہ ہے جو ایسے لوگوں کو بھی دیتا ہے جن سے ملنے کی امید

نہ تھی۔

۲۳- جو کسی پر احسان کرتا ہے تو خدا اس پر احسان کرتا ہے اور خدا احسان کرنے والوں کو دوست بنا لیتا ہے۔

۲۴- سب سے زیادہ صلہء رحمی کرنے والا وہ شخص ہے جو ایسے شخص سے صلہء رحمی کرے جس نے اس کے ساتھ صلہء رحمی نہ کی ہو۔

۲۵- اگر کسی کے ساتھ نیک سلوک کیا اور دوسرا اس کے ساتھ ایسا نہ کر سکا تو اللہ اس کا نیک بدلہ دیتا ہے۔

مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا حضرت حسینؑ نے حضرت حسن بصریؒ سے چند اخلاقی باتیں کیں۔ وہ انہیں سن کر بہت حیران ہوئے۔ سیدنا حسینؑ سے جان پہچان نہیں تھی جب وہ چلے گئے تو لوگوں سے پوچھا، یہ کون تھے؟

جواب ملا، حسینؑ بن علیؑ۔

یہ سن کر حضرت حسن بصریؒ بے ساختہ بولے، تم نے میری مشکل حل کر دی یعنی اب حیرت کی کوئی بات نہیں۔



سیدۃ النساء کی شیر دل بیٹی خاتونِ کربلا حضرت زینب کبریٰ

نام زینب اور کنیت اُمّ الحسن یا بروایت دیگر اُمّ کلثوم تھی۔ واقعہء کربلا کے بعد ان کی کنیت ”اُمّ المصائب“ بھی مشہور ہو گئی۔
حضرت زینب کبریٰ کے چند مشہور القاب یہ ہیں:
نائبۃ الزہراء، شریکۃ الحسین، راضیہ بالقدور والقضاء، شجاعہ، فصیحہ بلیغہ، زاہدہ
فاضلہ۔

مستند روایات کے مطابق حضرت زینبؓ جمادی الاولیٰ ۵ھ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ رسول اکرم ﷺ اس وقت مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے۔ تین دن بعد آپ تشریف لائے اور فاطمہؓ الزہراءؓ کے گھر تشریف لے گئے، بچی کو گود میں لیا اور بہت دیر تک روتے رہے پھر دہن مبارک میں کھجور چبائی اور لعاب مبارک بچی کے منہ میں ڈالا اس کے بعد حضور نے بچی کا نام زینب تجویز کیا اور فرمایا ”یہ ہم شبیہ خدیجہ ہے۔“

حضرت زینبؓ کی پرورش اور تربیت کا آغاز سرورِ کونین، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور سیدۃ النساء کے زیر سایہ ہوا۔ ایک دن عہدِ طفلی میں حضرت زینبؓ قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ بے خیالی میں سر سے اوڑھنی اتر گئی۔ سیدۃ النساء نے

دیکھا تو ان کے سر پر اوڑھنی ڈالی اور فرمایا، ”بیٹی اللہ کا کلام ننگے سر نہیں پڑھتے۔“ ایک دن حضرت حسینؑ اور حضرت زینبؑ میں معصومانہ لڑائی ہوگئی۔ سیدہ فاطمہؑ نے انہیں کلام مجید کی آیات پڑھ کر سنائیں اور فرمایا، ”بچو لڑائی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے۔“ دونوں بچے ڈر گئے اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی نہ لڑیں گے۔ فاطمہؑ الزہراءؑ بہت خوش ہوئیں اور انہیں سینے سے لگا لیا۔ رسول اکرم ﷺ بھی حضرت زینبؑ سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ کئی مرتبہ حسنینؑ کی طرح وہ بھی حضورؐ کے دوش مبارک پر سوار ہوئیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت زینبؑ بھی رسول اکرم ﷺ کے ساتھ تھیں۔ اس وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی اور یہ ان کا پہلا سفر تھا۔

۱۱۔ ہجری میں جب حضور پرنورؐ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپؐ نے سیدہ فاطمہ الزہراءؑ سے فرمایا کہ اپنے بچوں کو بلا لاؤ۔ وہ سب بچوں کو حضورؐ کے پاس لے گئیں۔ اپنے شفیق نانا کو بے چین دیکھ کر سب بچے رونے لگے۔ حضرت زینبؑ نے حضورؐ کے سینہ مبارک پر اپنا سر رکھ دیا۔ آپؐ نے ان کی پیشانی چومی اور اپنا دستِ شفقت ان کے سر پر پھیر کر دلا سا دیا۔

حضورؐ کی رحلت کے وقت سیدہ زینبؑ کی عمر تقریباً چھ برس کی تھی۔ چھ ماہ بعد شفیق والدہ سیدہ زہرا بتولؑ نے بھی وفات پائی۔ ان حادثوں نے ننھی زینبؑ کو سخت صدمہ پہنچایا۔ شفیق نانا اور جاں نثار ماں کی جدائی سے حیدر کرارؑ کے سارے بچے غم و الم کی مورتیں بن گئے۔ شیر خداؑ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام خود سنبھالا اور کچھ مدت کے بعد ان کی نگرانی کے لیے ام البنین بنت خزام کلابیہ سے نکاح کر لیا۔ علیؑ جیسے عالم معلم ہوں تو شاگردوں کی خوش بختی کا کیا ٹھکانا۔ تھوڑی ہی مدت میں سارے بچوں کے دل و دماغ علم و حکمت کے خزانوں سے معمور ہو گئے۔ حضرت زینبؑ نے بھی اپنے جلیل القدر باپؐ کے علم اور دوسرے اوصاف سے

خوب استفادہ کیا حتیٰ کہ زہد و تقویٰ، عقل و فراست، حق گوئی و بے باکی، عفت و عصمت اور عبادت و شب بیداری میں مثلِ فاطمۃ الزہراءؑ ہو گئیں۔ دراز قد اور مناسب الاعضا تھیں۔ چہرہ مبارک پر اپنے نانا کا جلال تھا اور حرکات و سکنات اور چال ڈھال میں وقارِ حیدری نمایاں تھا۔ تمام مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علم و فضل میں قریش کی کوئی لڑکی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بے مثال خطیب تھے۔ وہ اپنے خطبات اور تقاریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے تھے۔ حضرت زینبؑ کو اپنے عظیم باپ کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان و رشہ میں ملے۔ ان کے عدیم المثال خطبات تاریخ نے اپنے صفحوں میں محفوظ کر لیے ہیں، انہیں پڑھ کر کون سادل ہے جو پکھل نہ جائے اور کون سی آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہو جائے۔

اپنی لختِ جگر کے علم و فضل سے شیرِ خدا بھی مطمئن تھے۔ ان کے زمانہ خلافت میں حضرت زینبؑ کا قیام کوفہ ہی میں رہا۔ کوفہ کی خواتین اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآنِ حکیم کے معانی و مطالب پوچھا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ وہ چند عورتوں کے سامنے سورہ کھُیصص کی تفسیر بیان کر رہی تھیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تشریف لائے اور بڑے غور سے اپنی لختِ جگر کی تقریر سنتے رہے جب بیان ختم ہوا تو آپؑ نہایت مسرور ہوئے اور فرمایا:

”جانِ پدر میں نے تمہارا بیان سنا اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم کلامِ الہی کے مطالب اتنے عمدہ طریقے سے بیان کر سکتی ہو۔“

حضرت زینبؑ جب سنِ بلوغ کو پہنچیں تو قبیلہ کندہ کے رئیس اشعث بن قیس نے ان کے لیے پیغامِ نکاح بھیجا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بوجہ انکار کر دیا۔ اس کے بعد حیدر گرار کے بھتیجے شہیدِ مؤتہ حضرت جعفر طیارؑ بن ابی طالب

کے فرزند عبداللہ اپنے عم محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کے خواستگار ہوئے۔ حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت کے بعد رحمۃ اللعالمین نے خود عبداللہ کی پرورش و تربیت فرمائی تھی اور حضورؐ کے وصال کے بعد سے جناب علی مرتضیٰ ان کے نگران و سرپرست تھے۔ وہ بڑے پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے اور سیرت و صورت میں جو انان قریش میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ جناب مرتضیٰ نے ان کی درخواست قبول فرمائی۔ خاندان کے چند بزرگ عبداللہ بن جعفرؓ کو ساتھ لے کر مسجد میں آگئے اور حضرت علی مرتضیٰ نے نہایت سادہ طریق سے اپنی لخت جگر زینبؓ کا نکاح ان سے پڑھا دیا۔ اس وقت حضرت زینبؓ کی عمر بہ اختلاف روایت گیارہ یا تیرہ سال کی تھی۔ نکاح کے بعد خاندان کی عورتیں انہیں عبداللہ بن جعفرؓ کے گھر خود پہنچا آئیں۔ دوسرے دن انہوں نے دعوت ولیمہ کی۔ مہر کی رقم کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے بعض نے ۴۸۰ درہم لکھا ہے اور بعض نے چالیس ہزار، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اس وقت تجارت کرتے تھے اور ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔

حضرت زینبؓ کی خانگی زندگی نہایت خوشگوار تھی وہ اپنے شوہر کی بجد خدمت گزار تھیں اور وہ بھی ان کی دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے اگرچہ گھر میں لونڈیاں بھی تھیں اور خادم بھی لیکن زیادہ تر گھر کا کام کاج وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ فرمایا کرتے تھے، ”زینب بہترین گھر والی ہے۔“ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ بڑے فیاض اور سخی تھے، سیدۃ النساءؓ کی بیٹی بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ ناممکن تھا کہ کوئی سائل یا حاجت مندان کے دروازے پر آئے اور خالی ہاتھ چلا جائے یا کسی کی مصیبت کا انہیں پتہ چلے اور وہ اس کی خبر گیری نہ کریں۔ دونوں میاں بیوی کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کئی غیر مستحق لوگ بھی

ان کے دستِ کرم سے فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ امام حسینؑ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن جعفرؑ سے کہا، ”اے ابنِ عم تم بہت اسراف سے کام لیتے ہو اور غیر مستحق لوگوں کو بھی اپنی کمائی میں شریک کر لیتے ہو۔“

حضرت عبداللہ بن جعفرؑ نے جواب دیا، ”اے بھائی کیا کروں سائل کو دیکھ کر دل قابو میں نہیں رہتا، اللہ نے مجھے دولت اسی لیے دی ہے کہ اس کے بندوں میں بانٹوں۔“

خاوند کے گھر میں دولت کی ریل پیل حضرت زینبؑ کے مزاج میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکی وہ بدستور صبر و قناعت، سادگی اور جفاکشی کا پیکر بنی رہیں۔

۳۷ھ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عہدِ خلافت میں کوفہ کو اپنا مستقر بنایا تو حضرت زینبؑ اور عبداللہ بن جعفرؑ بھی کوفہ آگئے۔ کوفہ میں حضرت زینبؑ نہایت تندہی سے درس و تدریس اور وعظ و ہدایت کا کام انجام دیتیں۔ کوفہ کی اکثر خواتین ان کے پند و نصائح سے مستفیض ہوتیں۔ یوں ان کے علم و فضل کا چرچا گھر گھر پھیل گیا۔ ۷۱ رمضان المبارک ۴۰ھ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسجد میں بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز تھے کہ ایک بد بخت خارجی عبدالرحمن بن ملجم نے زہر آلود تلوار سے بھرپور وار کر کے انہیں شدید زخمی کر دیا۔ ابنِ ملجم کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔ حضرت زینبؑ نے اسے دیکھا تو فرمایا، ”اودشمن خدا تو نے امیر المؤمنین کو زخمی کر ڈالا۔“

ابنِ ملجم نے کہا ”امیر المؤمنین کو نہیں تمہارے باپ کو۔“

حضرت زینبؑ نے فرمایا: ”انشاء اللہ ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

ابنِ ملجم نے نہایت بے حیائی سے جواب دیا، ”تو پھر آہ و فغاں کیوں کرتی

ہو۔ خدا کی قسم کئی روز میں نے اپنی تلوار کو زہر پلایا ہے۔“

اسی زہر آلود تلوار کے زخم سے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ

۲۰ رمضان المبارک ۴۰ھ کو شہادتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو گئے۔ اپنے عالی رتبہ اور معدنِ علم و فضل باپ کی شہادت سے حضرت زینبؓ پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن ابھی ان کی قسمت میں اور بڑے بڑے صدمے لکھے تھے۔ ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں انہیں اپنے شفیق برادرِ بزرگ سیدنا حضرت حسنؓ کی شہادت کا صدمہ سہنا پڑا۔ اس وقت وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھیں۔ ذی الحجہ ۶۰ھ میں سیدنا حضرت حسینؓ نے اہل کوفہ کی دعوت پر اپنے اہل و عیال اور جاں نثاروں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکہ سے کوفہ کا عزم کیا تو حضرت زینبؓ بھی اپنے دو فرزندوں کے ہمراہ اس مقدس قافلے میں شامل ہو گئیں۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ اگرچہ خود اس قافلے میں شریک نہ ہو سکے تاہم انہوں نے حضرت زینبؓ اور اپنے بچوں کو سیدنا حسینؓ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ ہجری کو کربلا کا دلدوز سانحہ پیش آیا جس میں حضرت زینبؓ کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچے، بھتیجے، بھائی اور ان کے متعدد جاں نثار شامی فوج سے مردانہ وار لڑتے ہوئے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت زینبؓ نے جس حوصلے، شجاعت اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نو اور دس محرم کی درمیانی شب کو سیدنا حضرت حسینؓ کی تلوار صاف کی جانے لگی تو انہوں نے چند عبرت انگیز اشعار پڑھے اس وقت حضرت زینبؓ بے تاب ہو گئیں اور رورو کر کہنے لگیں:

”اے کاش آج کا دن دیکھنے کے لیے میں زندہ نہ ہوتی، پہلے میرے

نانا میری ماں میرے باپ اور میرے بھائی حسن سب داغِ مفارقت

دے گئے۔ اے بھائی اللہ کے بعد ہمارا سہارا اب آپ ہی ہیں ہم

آپ کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے۔“

سیدنا حسینؓ نے فرمایا، ”زینب صبر کرو۔“

حضرت زینبؓ نے روتے ہوئے عرض کی، ”میرے ماں جائے آپ کے بدلہ میں، میں اپنی جان دینا چاہتی ہوں۔“

سیدنا حسینؓ نے اپنی پیاری بہن کی دلدوز باتیں سن کر اشکبار ہو گئے لیکن نہایت حوصلہ سے فرمایا:

”اے بہن صبر کرو، خدا سے تسکین حاصل کرو، خدا کی ذات کے سوا ساری کائنات کے لیے فنا ہے۔ ہمارے لیے ہمارے نانا خیر البشرؐ کی ذاتِ اقدس نمونہ ہے۔ تم انہی کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا۔ اے بہن تمہیں خدا کی قسم ہے کہ اگر میں راہِ حق میں کام آ جاؤں تو میرے ماتم میں گریبان نہ پھاڑنا، چہرہ کو نہ نوچنا اور بین نہ کرنا۔“

۱۰ محترم کو جب تمام جاں نثارانِ اہل بیت ایک ایک کر کے دوشِ رسولؐ کے سوار پر قربان ہو گئے تو جوانانِ اہل بیت کی باری آئی۔ ہم شہیدہ پیغمبر حضرت علی اکبر بن حسینؓ دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے تو حضرت زینبؓ ”ابنِ اہاہ“ کہتی ہوئی دیوانہ وار خیمہ سے باہر دوڑیں، اس بھتیجے کو انہوں نے بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا، ان کی خاک و خون میں غلطاں لاش سے چمٹ گئیں۔ حضرت حسینؓ نے انہیں وہاں سے اٹھا کر خیمہ کے اندر بھیجا اور جوان فرزند کی لاش اٹھا کر خیمہ کے سامنے لے آئے۔

علی اکبرؓ کے بعد عبداللہ بن مسلم بن عقیلؓ، احمد بن حسنؓ، ابوبکر عبداللہ بن حسنؓ، جعفر بن عقیلؓ، عمر بن علیؓ، عثمان بن علیؓ اور دوسرے نوجوان سوائے سات نفوس کے ایک ایک کر کے نہایت شجاعت سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت زینبؓ کے دو فرزند عون بن عبداللہؓ اور محمد بن عبداللہؓ بھی معرکہء کربلا میں شہید ہوئے۔

ان کے بعد خانوادہٴ نبوت کے باقی نوجوان بھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے

اور سیدنا حسینؑ تنہا رہ گئے۔ زین العابدینؑ بیمار تھے اور لڑائی کے قابل نہیں تھے۔ انہیں اللہ اور اپنی بہن زینبؑ کے سپرد کیا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر فرزندِ رسولؐ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔ پیاس کا غلبہ تھا اپنے جگر کے ٹکڑوں اور جاں نثاروں کی شہادت سے دل ٹوٹا ہوا تھا لیکن اس قیامت کا حملہ کیا کہ دشمن کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ حیدر کڑاڑ کے فرزند جس طرف رخ کرتے دشمن کا دل بادل کائی کی طرح پھٹ جاتا۔ شامی بار بار نرغہ کرتے تھے لیکن جو نہی شمشیرِ حسینی چمکتی بھاگ کھڑے ہوتے۔ دوشِ رسولؐ کے سوار لڑتے لڑتے زخموں سے چور چور ہو گئے لیکن اللہ رے ہیبت کہ کوئی تنہا سامنے آنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ جمگھٹے بنا کر ہر طرف سے نیزوں، خنجروں، تیروں اور تلواروں کا مینہ برس رہا ہے تھے۔ حصین بن نمیر نے ایک نیزہ پھینکا جو گلوئے مبارک میں پیوست ہو گیا اور دہن مبارک سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ اپنے چلو میں تھوڑا سا خون لے کر آسمان کی طرف اچھالا اور فرمایا:

”مولا جو کچھ تیرے محبوب کے نواسہ کے ساتھ کیا جا رہا ہے تجھی سے اس کی فریاد کرتا ہوں۔“

حضرت زینبؑ نے دُور سے اپنے محبوب اور شفیق بھائی کو خون کی کلیاں کرتے دیکھا تو دوڑتی ہوئی رزمگاہ کے ایک قریبی ٹیلہ پر کھڑی ہو گئیں اور شامی فوج کے سردار عمر بن سعد (بن ابی وقاص) کو پکار کر کہا:

”اے عمر سعد کیا قیامت ہے کہ ابو عبد اللہ قتل کیے جا رہے ہیں اور تم دیکھ رہے ہو۔“

عمر بن سعد کی آنکھوں پر لالچ نے پردہ ڈال رکھا تھا لیکن پھر بھی سرورِ کونین کے ماموں زاد بھائی کا فرزند تھا، فرطِ ندامت سے رونے لگا اور حضرت زینبؑ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ تاہم شامیوں کو ظلم سے روکنا اس کی قسمت میں نہ لکھا تھا،

سیدنا حسینؑ حضرت زینبؑ کی آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے۔ سنگدل شامیوں نے شہیدانِ راہِ حق کے مقدس جسموں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا، سیدۃ النساءؑ کے لال کا سر اقدس نیزے پر چڑھایا اور پھر اہل بیت کے خیموں کا رخ کیا۔ ایک بد بخت نے چاہا کہ حضرت علی (زین العابدینؑ) کو بھی (جو بیمار تھے) شہید کر دے لیکن حضرت زینبؑ ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور فرمایا:

”خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں اس بیمار کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔“

ان کا عزم دیکھ کر وہ بد بخت اپنے ارادے سے باز آ گیا۔

۱۲ محرم الحرام ۶۱ھ کو تمام پسماندگان کو جن میں کچھ خواتین، بچے اور علی (زین العابدینؑ) بن حسین تھے اسیر کر کے کوفہ کی طرف لے چلے۔ شہداء کے لاشے ابھی میدانِ کربلا میں بے گور و کفن ہی پڑے ہوئے تھے۔ جب یہ ستم زدہ قافلہ ان کے پاس سے گزرا تو اہل قافلہ فرطِ غم سے نڈھال ہو گئے اور حضرت زینبؑ کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

”اے محمد مصطفیٰؐ آئیے دیکھئے آپ کے حسینؑ کا خون آغشته لاشہ چھیل

میدان میں پڑا ہے،

اس کا جسم پارہ پارہ کر دیا گیا ہے

آپؐ کی لڑکیاں رسیوں میں جکڑی ہوئی ہیں

آپؐ کی ذریت قتل کر کے گرم ریت پر بچھادی گئی ہے اور اس پر خاک

اڑ رہی ہے،

اے میرے نانا یہ آپؐ کی اولاد ہے جسے ہنکایا جا رہا ہے،

ذرا حسینؑ کو دیکھئے اس کا سر کاٹ لیا گیا ہے اور چادر چھین لی گئی ہے“

زینبؑ کبریٰؑ کا یہ نوحہ سن کر دوست دشمن سبھی روتے تھے۔ جب یہ مظلوم قافلہ

کوفہ میں داخل ہوا تو کوئی ہزاروں کی تعداد میں انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔

بے وفا کوفیوں کے ہجوم کو دیکھ کر شیرِ خدا کی بیٹی بے اختیار ہو گئی۔ ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”لوگو! اپنی نظریں نیچی رکھو یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی لٹی ہوئی اولاد ہے۔“

اس کے بعد انہوں نے اہل کوفہ کے سامنے ایک عبرت انگیز خطبہ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حیدر کرار تقریر فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

”اے کوفیو، اے مکارو، اے عہد شکنو! اپنی زبان سے پھر جانے والو، خدا کرے تمہاری آنکھیں ہمیشہ روتی رہیں تمہاری مثال ان عورتوں کی سی ہے جو خود ہی سوت کاتی اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ تم نے خود ہی میرے بھائی سے رشتہ بیعت جوڑا اور پھر خود ہی توڑ ڈالا۔ تمہارے دلوں میں کھوٹ اور کینہ ہے تمہاری فطرت میں جھوٹ اور دغا ہے۔ خوشامد، شیخی خوری اور عہد شکنی تمہارے خمیر میں ہے۔ تم نے جو کچھ آگے بھیجا ہے وہ بہت بُرا ہے۔ تم نے خیر البشر کے فرزند کو جو جنت کے جوانوں کے سردار ہیں قتل کیا ہے خدا کا قہر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

آہ کوفہ والو! تم نے ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے جو منہ بگاڑ دینے والا اور مصیبت میں مبتلا کر دینے والا ہے۔ یاد رکھو تمہارا رب نافرمانوں کی تاک میں رہتا ہے، اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔“

اس خطبہ کو سن کر کوفیوں کو اس قدر ندامت ہوئی کہ ان میں سے اکثر کی روتے روتے گھگھی بندھ گئی۔ حذلم بن کثیر جو عرب کے فصیح ترین آدمیوں میں شمار ہوتا تھا، وہ بھی حضرت زینبؓ کا خطبہ سننے والوں میں شامل تھا۔ خطبہ سن کر وہ سیدہ کے زورِ بیان اور فصاحت و بلاغت سے دنگ رہ گیا اور بے ساختہ اس کی زبان پر

سیدہ اور خاندانِ نبوت کے لیے تعریف و تحسین کے کلمات جاری ہو گئے۔

دوسرے دن کوفہ کے گورنر ابن زیاد نے دربار منعقد کیا۔ اسیرانِ اہل بیت کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت زینبؓ بہت خستہ حالت میں تھیں۔ ابن زیاد نے پوچھا: ”یہ عورت کون ہے؟“

ایک لونڈی نے کہا، ”زینب بنت علیؓ ہیں۔“

ابن زیاد نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں رسوا کیا اور تمہاری جدتوں کو جھٹلایا۔“

حضرت زینبؓ نے نہایت بے باکی سے جواب دیا۔ ”خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول محمدؐ کے ذریعے ہمیں عزت بخشی انشاء اللہ فاسق رسوا ہوں گے اور جھٹلائے جائیں گے۔“

ابن زیاد نے کہا، ”تم نے دیکھا تمہارے بھائی اور اس کے ساتھیوں کا کیا حشر ہوا؟“

حضرت زینبؓ نے فرمایا، ”اللہ تعالیٰ نے انہیں درجہ شہادت پر فائز کیا۔ عنقریب وہ اور تم داورِ محشر کے سامنے جمع ہوں گے اس وقت تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس کا کیا حشر ہوتا ہے۔“

ابن زیاد جھٹلا کر بولا، ”بنی ہاشم کے سب سے سرکش آدمی کے قتل سے میرا دل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“

حضرت زینبؓ کو ابن زیاد کے اس طرح اظہارِ مسرت کرنے پر بڑا دکھ ہوا۔ اُن کا آگینہء دل حوادثِ کربلا سے ٹوٹ چکا تھا بے اختیار رو دیں اور فرمایا:

”خدا کی قسم تو نے ہمارے گھر والوں کو نکالا، ہمارے ادھیڑوں کو قتل

کیا، ہماری شاخوں کو کاٹا، ہماری جڑوں کو اکھاڑا، اگر اسی سے تمہارا

دل ٹھنڈا ہونا تھا تو ہو گیا۔“

ابن زیاد سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اب اس کی نظر حضرت زین العابدینؓ پر پڑی۔ پوچھا، ”لڑکے تم کون ہو؟“

انہوں نے جواب دیا، ”علی بن حسینؓ۔“

ابن زیاد نے عمر بن سعد سے پوچھا، ”اسے کیوں نہیں قتل کیا؟“

اس نے جواب دیا، ”بیمار ہے۔“

ابن زیاد نے کہا ”اسے میرے سامنے قتل کرو۔“

حضرت زینبؓ یہ حکم سن کر تڑپ اٹھیں اور بولیں:

”اے ابن زیاد کیا تو ابھی تک ہمارے خون سے سیر نہیں ہوا کیا اس

نقاہت اور بیماری کے مارے ہوئے بچے کو بھی مارو گے۔ اگر اسے قتل

کرنا ہے تو اس کے ساتھ مجھے بھی مار ڈال۔“

یہ کہہ کر حضرت زین العابدینؓ سے چمٹ گئیں۔ ابن زیاد کے دل میں کچھ

خیال آ گیا اور اس نے حکم دیا کہ اس لڑکے کو عورتوں کے ساتھ رہنے کے لیے چھوڑ

دو۔ چند دن بعد ابن زیاد نے شہداء کے سروں اور اسیرانِ اہل بیت کو فوج کے

پہرے میں یزید کے پاس دمشق روانہ کر دیا۔

کوفہ سے دمشق تک کے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد

اسیرانِ اہل بیت یزید کے دربار میں پیش کیے گئے۔ ایک سرخ رنگ کے شامی نے

فاطمہ بنتِ حسینؓ یا بروایتِ دیگر سکیئہ بنتِ حسینؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا

”امیر المؤمنین یہ لڑکی مجھے دے دیجئے۔“

حضرت زینبؓ تڑپ اٹھیں اور بولیں — ”خدا کی قسم یہ لڑکی نہ تجھے مل سکتی

ہے اور نہ یزید کو جب تک کہ اللہ کے دین کو ترک کرنے کا اعلان نہ کر دے۔“

شامی نے دوبارہ یہی سوال کیا لیکن یزید نے اسے روک دیا۔
 جب امام حسینؑ کا سرِ اقدس یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو خواتین اہل بیت
 رونے لگیں۔ حضرت زینبؑ نے سرِ اقدس کی طرف مخاطب ہو کر کہا:
 ”اے حسینؑ، اے محمد مصطفیٰؐ کے دل بند، اے دوشِ پیمبرؐ کے سوار، اے
 فاطمہ الزہراءؑ کے لختِ جگر، اے جنت کے جوانوں کے سردار۔“

یزید نے پوچھا، ”یہ عورت کون ہے؟“
 اسے بتایا گیا کہ حسینؑ کی چھوٹی بہن زینبؑ ہیں۔
 یزید نے حضرت زینبؑ سے مخاطب ہو کر کہا ”کیا تمہارا بھائی یہ نہیں
 کہتا تھا کہ میں یزید سے بہتر ہوں اور میرا باپ یزید کے باپ سے
 بہتر تھا۔“

حضرت زینبؑ نے دلیری سے جواب دیا، ”بے شک میرا بھائی سچ کہتا
 تھا۔“

یزید نے کہا ”میری عمر کی قسم، حسینؑ کے نانا میرے دادا سے بہتر تھے،
 حسینؑ کی ماں میری ماں سے بہتر تھیں۔ رہا میرا باپ اور حسینؑ کا باپ
 تو سب کو معلوم ہے کہ خدا نے کس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔“

اس پر حضرت زینبؑ نے یزید اور اس کے اہل دربار کو مخاطب کر کے
 ایک دردناک تقریر کی۔ انہوں نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

”اے یزید گردشِ افلاک اور ہجومِ آفات نے مجھے تجھ سے مخاطب
 ہونے پر مجبور کر دیا۔ یاد رکھ رب العزت ہم کو زیادہ عرصہ تک اس حال
 میں نہ رکھے گا۔ ہمارے مقاصد کو ضائع نہ کرے گا۔ تو نے ہمیں
 نقصان نہیں پہنچایا اپنے آپ کو پہنچایا ہے۔ آہ تیرے آدمیوں نے
 دوشِ رسولؐ کے سوار اور اس کے بھائیوں، فرزندوں اور رفقاء کو نہایت

بے دردی سے ذبح کر دیا۔ انہوں نے پردہ نشین اہل بیت کی بے حرمتی کی۔ اے کاش تو اس وقت شہیدانِ کربلا کو دیکھ سکتا تو اپنی ساری دولت و حشمت کے بدلے اُن کے پہلو میں کھڑا ہونا پسند کرتا۔ ہم عنقریب اپنے نانا کی خدمت میں حاضر ہو کر ان مصائب کو بیان کریں گے جو تیرے بے درد ہاتھوں سے ہمیں پہنچے ہیں اور یہ اس جگہ ہوگا جہاں اولادِ رسولؐ اور ان کے ساتھی جمع ہوں گے۔ ان کے چہروں کا خون اور جسموں کی خاک صاف کی جائے گی۔ وہاں ظالموں سے بدلہ لیا جائے گا۔ حسینؑ اور ان کے ساتھی مرے نہیں اپنے خالق کے پاس زندہ ہیں اور وہی ان کے لیے کافی ہے۔ وہ عادلِ حقیقی، نبیؐ کی اولاد اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے والوں سے ضرور بدلہ لے گا۔ وہی ہماری امیدگاہ ہے اور اسی سے ہم فریاد کرتے ہیں۔“

سیدہ زینبؑ کا خطبہ سن کر یزید اور اس کے درباری سکتے میں آگئے۔ یزید کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں لوگ خاندانِ رسالت کی حمایت میں میرے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اس نے خواتینِ اہل بیت کو اپنے خاص حرم سرا میں ٹھہرایا اور جہاں تک ہوسکا ان کی دلجوئی کی کوشش کی۔ چند دن بعد اس نے حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ کے زیرِ حفاظت قافلہ اہل بیت کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ جب قافلہ چلنے لگا تو حضرت زینبؑ نے فرمایا:

”محملوں پر سیاہ چادریں ڈال دو تا کہ دیکھنے والوں کو پتہ چل جائے کہ یہ سیدۃ النساءؑ کی دلفگار اولاد ہے۔“

حضرت نعمانؓ نے جہاں تک ہوسکا ان مصیبت زدہ مسافروں کی مدد کی اور راستے میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ جب یہ قافلہ کربلا پہنچا تو وہاں حضرت

جابر بن عبداللہ اور بنی ہاشم کے کچھ لوگ پہنچے ہوئے تھے انہیں دیکھ کر حضرت زینبؓ رونے لگیں۔ اس موقع پر موجود دوسرے سب لوگ بھی رونے لگے۔ جب قافلہ مدینہ منورہ پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا۔ فاتح خیبرؓ کی غیور بیٹیوں زینبؓ اور فاطمہؓ نے حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ کو ان کے حسن سلوک کے عوض اپنی چوڑیاں اتار کر بھیجیں اور فرمایا کہ اس وقت ہمارے پاس اور کچھ نہیں کہ آپ کی خدمت کا معاوضہ دیں۔

نعمانؓ اشکبار ہو گئے اور کہا ”اے بناتِ رسولؐ خدا کی قسم میں نے جو کچھ کیا ہے صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے کیا ہے یہ چوڑیاں آپ ہی کو مبارک ہوں۔“

اس دن سارا مدینہ منورہ سوگوار تھا۔ ہزاروں لوگوں نے روتے ہوئے ان مصیبت زدہ مسافروں کی پیشوائی کی۔ حضرت زینبؓ روضہ نبویؐ پر حاضر ہوئیں تو ان کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا اور زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

”اے میرے مقدس نانا جان میں آپ کے فرزند اور اپنے بھائی حسینؓ کی شہادت کی خبر لائی ہوں۔ آپ کی اولاد کو رسیوں سے باندھ کر کوفہ اور دمشق کی گلیوں میں پھرایا گیا۔“

حضرت زینبؓ کے الفاظ سن کر ہر شخص رونے لگا۔ پھر وہ اپنی والدہ ماجدہ سیدۃ النساء فاطمہ الزہراءؓ کے مزار پر گئیں اور اس درد سے روئیں کہ پتھروں کا کلیجہ بھی پانی ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں سے ملیں، انہیں اپنی رودادِ غم سنائی اور سب کو صبر کی تلقین کی۔

بے پناہ مصائب نے حضرت زینبؓ کے دل و جگر کے ٹکڑے اڑا دیئے تھے۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی ۶۲ھ میں انہوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور یوں یتیمانِ اہل بیت کی سرپرست، شہدائے کربلا کی یادگار

اور دشمنوں کو عذابِ خدا سے ڈرانے والی بے مثال خطیبہ اپنے محبوب و مظلوم بھائی سے جنت الفردوس میں جا ملیں۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت زینبؓ اپنے شوہر حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے ساتھ شام چلی گئیں۔ دمشق کے پاس حضرت عبداللہؓ کی کچھ زمینداری تھی وہاں پہنچنے کے بعد بیمار ہوئیں اور وہیں رحلت فرمائی۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت زینبؓ شہیدانِ کربلا کے مصائبِ نہایت درد انگیز لہجہ میں کمال فصاحت و بلاغت سے لوگوں کو سنایا کرتی تھیں لوگ ان سے بہت متاثر ہوتے اور ان میں اہل بیت کی حمایت کا جذبہ پیدا ہوتا۔ عاملِ مدینہ نے ان حالات کی اطلاع یزید کو دی۔ اُس نے حکم بھیجا کہ زینبؓ کو کسی دوسرے شہر میں بھیج دو۔ حضرت زینبؓ نے پہلے تو جانے سے انکار کیا پھر بعض ہوا خواہوں کے سمجھانے بجھانے سے رضامند ہو گئیں اور سکینہؓ و فاطمہؓ بناتِ حسینؓ اور کچھ دوسری قرابت دار خواتین کے ہمراہ مصر چلی گئیں، وہاں کے والی حضرت مسلمہؓ بن مغلد انصاری نے ان کی نہایت عزت و تکریم کی اور اپنے دارالاقامہ میں ٹھہرایا۔ تقریباً ایک سال بعد ۶۲ھ میں حضرت زینبؓ نے وہیں وفات پائی۔ واللہ اعلم بالصواب۔



حضرت اُمّ کلثوم بنت علیؓ

حضرت زینب صغریٰ جن کی کنیت اُمّ کلثوم تھی، حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ کی چھوٹی بیٹی تھیں (بڑی حضرت زینب کبریٰ تھیں) کتاب ”ارشاد شیخ مفید“ میں اس کی تصریح یوں کی گئی ہے:

”وَأَوْلَادُ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ سَبْعَةٌ وَعِشْرُونَ وَلَدًا
ذَكَرًا أَوْ أُنْثَى الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ وَزَيْنَبُ الْكُبْرَى وَزَيْنَبُ
الصُّغْرَى الْمَكْنَاءُ بِأُمِّ كَلْثُومٍ أُمَّهُمُ فَاطِمَةُ الْبَتُولُ سَيِّدَةُ نِسَاءِ
الْعَالَمِينَ بِنْتُ سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ .“

(امیر المؤمنین علیہ السلام کی اولاد میں ستائیس بیٹے اور بیٹیاں تھیں،
الحسنؓ، الحسینؓ، زینب کبریٰؓ، زینب صغریٰؓ جن کی کنیت اُمّ کلثوم تھی،
ان سب کی والدہ تمام جہانوں کی خواتین کی سردار فاطمہؓ البتولؓ تمام
رسولوں کے سردار کی بیٹی ہیں)

(محّب اہل بیت کون؟ از سید شبیر حسین شاہ بحوالہ ارشاد شیخ مفید مطبوعہ تہران ص ۱۶۷)

حضرت اُمّ کلثومؓ کا پہلا نکاح امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ سے ہوا۔ علامہ
شبلی نعمانیؒ نے ”الفاروق“ میں حضرت عمر فاروقؓ کی ”ازواج و اولاد“ کے باب
میں اس نکاح کا حال بدیں الفاظ بیان کیا ہے:

”اخیر عمر میں اُن (حضرت عمرؓ) کو خیال ہوا کہ خاندانِ نبوت سے تعلق

پیدا کریں جو مزید شرف اور برکت کا باعث تھا۔ چنانچہ جناب امیر (حضرت علیؓ) سے حضرت اُمّ کلثومؓ کے لیے درخواست کی۔ جناب ممدوحؓ نے پہلے اُمّ کلثومؓ کی صغریٰ کے سبب سے انکار کیا لیکن حضرت عمرؓ نے زیادہ تمنا ظاہر کی اور کہا کہ اس سے مجھے حصول شرف مقصود ہے جو جناب امیرؓ نے منظور فرمایا اور ۷۱ھ ہجری میں ۴۰ ہزار مہر پر نکاح ہوا۔

علامہ شبلیؒ نے حاشیہ میں اس عبارت کی تشریح یوں کی ہے:

”حضرت اُمّ کلثوم بنتِ فاطمہؓ کی تزویج کا واقعہ تمام معتمد مؤرخوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ علامہ طبریؒ نے ”تفسیر کبیر“ میں ابنِ حبان نے ”کتاب الثقات“ میں، ابنِ قتیبہ نے ”معارف“ میں اور ابنِ اثیر نے ”کامل“ میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ اُمّ کلثوم بنتِ فاطمہ زہراءؓ حضرت عمرؓ کی زوجہ تھیں۔ ایک دوسری اُمّ کلثوم بھی ان کی زوجہ تھیں لیکن ان مؤرخوں نے صاف تصریح کی ہے۔ علامہ طبریؒ و ابنِ حبان و ابنِ قتیبہ کی تصریحات میری نظر سے گزری ہیں اور ان سے بڑھ کر تاریخی واقعات کے لیے اور کیا سند ہو سکتی ہے میں وہ عبارتیں اس موقع پر نقل کرتا ہوں۔ ”ثقات“ میں ذکرِ خلافت حضرت عمرؓ واقعات ۷۱ھ ہجری میں ہے: ”ثُمَّ تَزَوَّجُ عُمَرُ اُمَّ كَلثُومِ بِنْتِ عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِبٍ بِنْتِ فَاطِمَةَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.“

”أَسَدُ الْغَابَةِ فِي اَحْوَالِ الصَّحَابَةِ“ میں ابنِ اثیر نے جہاں حضرت اُمّ کلثوم کا حال لکھا ہے تفصیل کے ساتھ ان کی تزویج کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اسی طرح طبریؒ نے جا بجا تصریح کی ہے جس کو ہم تطویل کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صحیح بخاری میں ایک نمونی

موقع پر حضرت اُمّ کلثومؓ کا ذکر آ گیا ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے عورتوں میں چادریں تقسیم کیں۔ ایک بچ رہی اس کے متعلق تردید تھا کہ کس کو دی جائے۔ ایک شخص نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

”يَا امِيرَ الْمُؤْمِنِينَ اعْطِ هَذَا بِنْتَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْكَ يُرِيدُ امَّ كَلْثُومٍ“ .

(صحیح بخاری باب الجہاد مطبوعہ میرٹھ صفحہ ۲۰۳)

اس میں صاف تصریح ہے کہ اُمّ کلثوم جو حضرت عمرؓ کی زوجہ تھیں، خاندانِ نبوت سے تھیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت اُمّ کلثومؓ کے بطن مبارک سے حضرت عمرؓ کا ایک بیٹا زید پیدا ہوا ماں اور بیٹا دونوں ایک ہی ساعت میں فوت ہو گئے۔ مولانا سید شبیر حسین شاہ نے اپنی کتاب ”محبت اہل بیت کون؟“ میں حضرت جعفر صادقؑ کی یہ روایت نقل کی ہے:

”اُمّ کلثوم بنت علیؑ اور اُمّ کلثومؓ کا بیٹا زید بن عمرؓ بن خطاب دونوں ایک ساعت میں اکٹھے فوت ہوئے۔“

(محبت اہل بیت کون، بحوالہ تہذیب الاحکام ص ۳۸۰)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی صلب سے حضرت اُمّ کلثومؓ کی ایک بیٹی رقیہ بھی پیدا ہوئی۔ وہ بھی صغریٰ میں فوت ہو گئی۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت اُمّ کلثومؓ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد عرصہ تک زندہ رہیں۔ انہوں نے نکاح ثانی عون بن جعفرؓ بن ابی طالب سے کیا۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ عون کی رحلت کے بعد ان کے بھائی محمد بن جعفرؓ نے ان سے نکاح کیا۔ ان سے ایک لڑکی ہوئی جو لڑکپن میں فوت ہو گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(الزہراء عمر ابوالنصر بحوالہ تہذیب النوری، سیرۃ کبریٰ جلد دوم، ابوالقاسم رفیق دلاوری)

حضرت فضہؓ

(سیدہ فاطمہؓ الزہراءؓ کی وفادار کنیز)

حضرت فضہؓ، حضرت فاطمہؓ الزہراءؓ کی کنیز تھیں۔ ارباب سیر نے اس کی تصریح نہیں کی کہ وہ سیدہ فاطمہؓ کی حیات پاک کے کس دور میں ان کی خدمت میں آئیں البتہ مختلف روایتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ زندگی بھر خاندان نبوت سے وابستہ رہیں۔ بعض روایتوں میں ان کا وطن حبش بیان کیا گیا ہے اور بعض میں نوبیہ (سوڈان)۔ ان کے شرف صحابیت پر سب اہل سیر کا اتفاق ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کا اصل نام میمونہ تھا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدل کر فضہ رکھا۔

حضرت فضہؓ نہ صرف گھر کے کام کاج میں سیدہ فاطمہؓ کا ہاتھ بٹاتی تھیں بلکہ ان کے ہر دکھ سکھ میں بھی شریک رہتی تھیں۔ اس طرح وہ حضرت علیؓ کے گھر کا ایک فرد بن گئی تھیں۔ علامہ طبری کا بیان ہے کہ حضرت فاطمہؓ الزہراءؓ نے وفات پائی تو ان کو غسل دیتے وقت حضرت فضہؓ بھی موجود تھیں۔ سیدہؓ کا جنازہ اٹھنے لگا تو حضرت علیؓ نے اہل خانہ کو اس طرح آواز دی:

”اے ام کلثوم، اے زینب، اے فضہ، اے حسن، اے حسین آؤ اور اپنی ماں کو آخری بار دیکھ لو۔ اب تمہاری جدائی ہو رہی ہے اور پھر جنت میں ہی

ملاقات ہوگی۔“

سیدہ فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت فضہ سیدہ زینب بنت علیؓ کی کنیزی میں آگئیں اور مصائبِ کربلا میں ان کے ساتھ شریک رہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فضہ کا نکاح ابو ثعلبہ حبشیؓ سے کر دیا تھا۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ابو ثعلبہؓ کی وفات کے بعد ان کا نکاح ابوسیک غطفانیؓ سے ہوا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت فضہ کی ایک لڑکی (مسکہ) اور پانچ لڑکے تھے۔

حضرت فضہ کے سال وفات کے بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ملتی البتہ بعض ارباب سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ حضرت زینب بنت علیؓ کی رحلت کے چند سال بعد فوت ہوئیں اور ان کی قبر حضرت زینبؓ کی قبر کے ساتھ شام میں ہے۔



خواتین اسلام سے اسلام

کے

مطالبے

- ☆ اپنی زیب و زینت کی چیزوں کا مردوں پر اظہار نہ ہونے دیں۔
- ☆ اپنے زیورات کی آواز تک غیر محرموں کے کان تک نہ جانے دیں۔
- ☆ خوشبو، عطر وغیرہ لگا کر گھر سے باہر نہ نکلیں۔
- ☆ مردوں سے گفتگو کرتے وقت لب و لہجہ اور آواز میں نزاکت پیدا نہ کریں۔
- ☆ راہ چلتے یا مرد سے باتیں کرتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھیں۔
- ☆ ایسے راستہ سے نہ گزریں جہاں مردوں کی ریل پیل ہو بلکہ کنارے کنارے ہو کر گزریں۔
- ☆ گھر سے باہر نکلنے کے بعد اپنی چال ڈھال میں حیا کو مقدم رکھیں۔
- ☆ کسی غیر عورت کی صفت اپنے خاوند سے بیان نہ کریں۔
- ☆ کسی غیر محرم کے ساتھ سفر نہ کریں خواہ سفر حج ہی کیوں نہ ہو۔
- ☆ اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔

خواتین اسلام سے خطاب

(ماہر القادری مرحوم)

یہ شرح آیہ عصمت ہے جو ہے بیش نہ کم
 دل و نظر کی تباہی ہے قربِ نامحرم
 حیا ہے آنکھ میں باقی نہ دل میں خوفِ خدا
 بہت دنوں سے نظامِ حیات ہے برہم
 یہ سینما یہ کلب گھر یہ مدرسے یہ چمن
 انہیں کے بھیس میں شیطان نے لیا ہے جنم
 یہ سیر گا ہیں کہ مقتل ہیں شرم و غیرت کے
 یہ معصیت کے مناظر ہیں زینتِ عالم
 یہ نیم باز سا برقع و دیدہ زیب نقاب
 جھلک رہا ہے جھلا جھل قمیص کا ریشم
 تری حیات ہے کردارِ رابعہ بصری
 ترے فسانے کا موضوع عصمتِ مریم

حجاب و شرم و حیا زندگی ہے عورت کی
 جو یہ نہ ہو تو برابر ہے پھر وجود و عدم
 نہ دیکھ رشک سے تہذیب کی نمائش کو
 کہ سارے پھول یہ کاغذ کے ہیں خدا کی قسم
 وہی ہے راہ ترے عزم و شوق کی منزل
 جہاں ہیں عائشہؓ و فاطمہؓ کے نقشِ قدم



کتابیات

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں جن کتابوں سے بلا واسطہ یا بالواسطہ خاص طور پر مدد لی گئی ہے ان کے نام یہ ہیں:

- ۱- صحیح بخاری
- ۲- صحیح مسلم
- ۳- مسند ابی داؤد
- ۴- جامع ترمذی
- ۵- مستدرک حاکم
- ۶- الطبقات الکبریٰ ————— ابن سعد
- ۷- السیرۃ النبویہ ————— ابن ہشام
- ۸- أسد الغابہ ————— ابن اثیر
- ۹- الكامل فی التاریخ ————— ابن اثیر
- ۱۰- البدایہ والنہایہ ————— ابن کثیر
- ۱۱- الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ————— حافظ ابن عبدالبر
- ۱۲- الاصابہ فی تسمیۃ الصحابہ ————— حافظ ابن حجر
- ۱۳- تہذیب التہذیب ————— حافظ ابن حجر
- ۱۴- تاریخ الامم والملوک ————— ابن جریر طبری
- ۱۵- تاریخ ابن عساکر ————— ابن عساکر
- ۱۶- مدارج النبوة ————— شیخ عبدالحق محدث دہلوی

- ۱۷- اردو دائرہ معارف اسلامیہ ————— (مختلف جلدیں) دانش گاہ پنجاب لاہور
- ۱۸- سیرۃ کبریٰ ————— ابوالقاسم رفیق دلاوری
- ۱۹- سیرۃ عائشہؓ ————— سید سلیمان ندوی
- ۲۰- سیر الصحابیات ————— مولانا سعید انصاری مرحوم
- ۲۱- سیر الصحابہ جلد اول و دوم ————— مولانا سعید انصاری مرحوم
- ۲۲- سیر الصحابہ جلد ششم ————— مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم
- ۲۳- خلفاء راشدینؓ ————— مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم
- ۲۴- خاتونِ جنت ————— منشی تاج الدین احمد تاج مجددی
- ۲۵- احسینؑ ————— عمر ابوالنصر
- ۲۶- الزہراءؑ ————— عمر ابوالنصر
- ۲۷- فاطمہ بنت محمدؑ ————— رئیس احمد جعفری مرحوم
- ۲۸- سیرتِ فاطمہ الزہراءؑ ————— مولانا عبدالجید سوہدروی مرحوم
- ۲۹- سیدہ فاطمہ زہراءؑ ————— ابو محمد امام الدین رام نگری مرحوم
- ۳۰- خاتونِ جنت فاطمہ زہراءؑ ————— ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم
- ۳۱- خلفاء راشدینؓ کی یگانگت ————— منشی عبدالرحمن خان
- ۳۲- تسبیحِ فاطمہؑ ————— علامہ فضل احمد عارف
- ۳۳- فدک ————— غلام مصطفیٰ چشتی مرحوم
- ۳۴- ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور (علیٰ نمبر) ————— مرتبہ مجیب الرحمن شامی
- ۳۵- ماہنامہ ضیائے حرم لاہور (صدیق اکبر نمبر) ————— مرتبہ خواجہ عابد نظامی



طالب ہاشمی

☆ صحابہؓ کی پاکیزہ زندگی کے حالات

☆ صحیح واقعات و حالات پر مبنی تحقیق ☆ بے شمار کتب کا نچوڑ

☆ منفرد اندازِ تحریر ☆ دل میں اتر جانے والا اُسلوبِ نگارش

☆ رحمت دارین کے سوشیدائی	سو صحابہ کرامؓ کے روح پرورد کرے
☆ تمیں پروانے شمع رسالتؐ کے	تمیں جلیل اقدار صحابہؓ کے ایمان افروز حالات
☆ خیر البشرؐ کے چالیس جانثارؓ	چالیس صحابہؓ کے روح پرورد حالاتِ زندگی
☆ تذکارِ صحابیات	دو سو پچاس صحابیاتؓ کے ایمان افروز حالات
☆ تذکارِ صالحات	تاریخ اسلام کی نامور خواتین کا تذکرہ
☆ پچاس صحابہؓ	پچاس صحابہؓ کی پاکیزہ زندگی کے حالات
☆ خلیفۃ الرسولؐ	حضرت ابو بکر صدیقؓ کے جامع حالاتِ زندگی
☆ سیرت حضرت فاطمۃ الزہراءؓ	جگر گوشہ رسولؐ پر منفرد کتاب
☆ ہمارے رسولؐ پاک	بچوں کے لیے نہایت خوبصورت تحفہ
☆ حسنِ گفتار	مختصر مضامین - سبق آموز - تربیت اور ترقی کے لیے نہایت مفید